

سبط حسن

مُغنّیٔ آتش نفس، سجاد ظہیر



ترتیب وتدوین

ڈاکٹر سید جعفر احمد

مُغنّیٔ آتش نفس، سجاد ظہیر

سبط حسن

ترتیب و تدوین

ڈاکٹر سید جعفر احمد

دانیال

ڈھونڈے ہے اس مُغنّیِ آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے
—غالبؔ

ناشر : حوری نورانی

مطبع : سمیع پریس، کراچی

اشاعت : تیسری بار ۲۰۱۶ء

قیمت : Rs650-00

ISBN: 978-969-419-070-9

PAKISTAN PUBLISHING HOUSE
مکتبۂ دانیال

Snowhite Centre, Opposite Jabees Hotel
Mezzanine Floor, Abdullah Haroon Road, Karachi-74400
Phone: 35681457-35682036-35681239
Email: danyalbooks@hotmail.com

فہرست

عرضِ مرتّب

یہ کتاب سجاد ظہیر کی ادبی و سیاسی خدمات اور ان کی شخصیت کے بارے میں سید سبط حسن کے مختلف مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے یہی بات کیا کچھ کم ہے کہ یہ ترقی پسند تحریک کے ایک سربرآوردہ رہنما کے بارے میں دوسرے رہنما کی تحریروں پر مشتمل ہے۔ سجاد ظہیر ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں شامل تھے۔ جب انجمن ترقی پسند مصنفین کی داغ بیل ڈالی گئی تو وہ اس کے جنرل سیکریٹری چنے گئے۔ وہ ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی سے بھی وابستہ تھے۔ تقسیم ہند کے بعد وہ پاکستان تشریف لے آئے اور یہاں کی کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکریٹری مقرر ہوئے۔ سبط حسن صاحب انجمن ترقی پسند مصنفین اور کمیونسٹ پارٹی دونوں میں سجاد ظہیر کے ساتھ شامل تھے۔ ترقی پسند مصنفین کی تحریک میں سبط حسن کے فعال کردار کے بارے میں اوروں نے بھی بہت کچھ لکھا ہے مگر شاید اس کا معتبر ترین حوالہ ہمیں سجاد ظہیر کے یہاں ملتا ہے جنہوں نے اپنی کتاب 'روشنائی' میں کئی جگہ اس کردار کا ذکر کیا ہے۔ سبط حسن صاحب کو سجاد ظہیر کے ساتھ جو قریبی تعلق حاصل رہا اس نے انہیں سجاد ظہیر کے مزاج، ان کے ادبی تصورات اور ان کی سیاسی

صلاحیتوں کو سمجھنے میں بہت مدد دی۔

قیام پاکستان سے پہلے انجمن ترقی پسند مصنفین اور کمیونسٹ پارٹی کی ادبی و صحافتی سرگرمیوں کے حوالے سے ہر دو ادیبوں اور رہنماؤں میں جس تعلق کی بنیاد پڑی تھی وہ قیام پاکستان کے بعد بھی جاری رہا تا آنکہ ۱۹۵۱ء میں نام نہاد راولپنڈی سازش کو بنیاد بنا کر ملک کے چیدہ چیدہ ترقی پسند رہنماؤں اور ادیبوں کو گرفتار کرلیا گیا۔ سجاد ظہیر اور سبط حسن الگ جیلوں میں رہے اور پھر جب ۱۹۵۵ء میں سجاد ظہیر کی رہائی عمل میں آئی تو وہ کچھ ہی روز بعد ہندوستان چلے گئے۔ پاکستان اور ہندوستان کے تعلقات کے بگاڑ نے جہاں دونوں ملکوں کے عوام کے درمیان معمول کے روابط قائم نہیں ہونے دیئے وہیں ادیبوں اور شاعروں اور ان کی تخلیقات کے تبادلے میں بھی موانعات حائل رہے۔ سجاد ظہیر اور سبط حسن ایک طویل عرصے کے بعد ۱۹۷۳ء میں ایک مرتبہ پھر ایک دوسرے کے ساتھ رابطے میں آئے مگر یہ تجدیدِ ملاقات جو سابق سوویت یونین میں ایک بین الاقوامی کانفرنس کے حوالے سے ہو پائی تھی، دیرپا ثابت نہیں ہوسکی۔ سجاد ظہیر اسی سال وفات پاگئے۔ ان کی وفات کا صدمہ سبط حسن صاحب کے لیے صرف ایک ادبی و سیاسی رہنما کے اٹھ جانے کا صدمہ ہی نہیں تھا بلکہ ایک ذاتی نقصان بھی تھا۔ وہ ایک ایسے رفیق و دمساز سے محروم ہوگئے تھے جس کی صحبت میں انہوں نے برسوں پہلے ایک نئی دنیا کی تعمیر کے خواب دیکھے تھے۔

سجاد ظہیر کی وفات کے بعد سبط حسن صاحب نے کراچی میں منعقد ہونے والے کئی تعزیتی جلسوں میں ان کے بارے میں اظہارِ خیال کیا۔ اس کے علاوہ انگریزی اخبار 'ڈان' میں ان کا ایک مضمون بھی شائع ہوا۔ ۱۹۷۶ء میں جب مکتبۂ دانیال سے 'روشنائی' کا ایڈیشن شائع ہوا تو سبط حسن صاحب نے اس کے دیباچے میں سجاد ظہیر کی ادبی خدمات اور 'روشنائی' کی تاریخی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ سجاد ظہیر کے مجموعے 'پگھلا نیلم' کی اشاعت پر وہ کوئی مبسوط مضمون تو نہ لکھ سکے مگر ایک آدھ تقریب میں انہوں نے اس پر اظہارِ خیال ضرور کیا۔ 'ذکر

حافظ' کی پاکستان، میں اشاعت پر 'ڈان' میں انہوں نے ایک مفصل تبصرہ تحریر کیا۔ سبط حسن صاحب کی یہ سب تحریریں پہلی مرتبہ یکجا صورت میں اس کتاب میں شائع ہو رہی ہیں۔ ان تحریروں کی اپنی جداگانہ حیثیت اور اہمیت تو ہے ہی مگر یکجا ہوکر یہ ایک بھرپور مطالعے کی حیثیت اختیار کرگئی ہیں۔

مذکورہ بالا تحریروں کے علاوہ اس کتاب میں سبط حسن صاحب کی ایک نادر اور غیر مطبوعہ تحریر بھی پہلی بار منظر عام پر آرہی ہے۔ یہ، اس کتاب کا پہلا مضمون ہے جو نہ صرف یہ کہ ایک تاریخی اہمیت کا حامل ہے بلکہ میری ذاتی رائے میں یہ سجاد ظہیر کے بارے میں سبط حسن صاحب کی دیگر تمام تحریروں پر بھاری ہے۔ یہ مضمون سبط حسن صاحب کے اور بہت سے نامکمل منصوبوں میں سے ایک ہے۔

بظاہر یہ مضمون مکمل ہی ہے کیونکہ اس میں سبط حسن صاحب نے سجاد ظہیر کے ساتھ اپنی پہلی ملاقات سے لے کر آخری ملاقات تک کا احاطہ کرلیا ہے مگر مضمون کی آخری سطور سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید وہ اس مضمون کو کچھ اور بھی آگے بڑھانا چاہتے تھے۔ جو لوگ سبط حسن صاحب کے کام کرنے کے انداز سے واقف ہیں ان کو معلوم ہوگا کہ وہ اپنی کسی تحریر کو اشاعت کی غرض سے پریس بھجوانے کے وقت تک اس میں ترمیم و اضافہ کرتے رہتے تھے۔ زیرِ نظر مضمون کے مسودے میں بھی گو کہ انہوں نے خاصی قطع و برید کی ہے لیکن اگر یہ ان کی زندگی میں شائع ہوتا تو کون کہہ سکتا ہے کہ اس میں ان کے قلم سے مزید کانٹ چھانٹ نہ ہوتی یا مزید اجزاء اس میں شامل نہ کیے گئے ہوتے۔ یہی نہیں بلکہ ایک اور امر جو ہمیں اس مضمون کو نامکمل قرار دینے پر مائل کرتا ہے وہ اس مضمون پر کسی عنوان کا نہ ہونا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ سبط حسن صاحب نے ابھی مضمون کا عنوان طے نہ کیا ہو یا ایک سے زائد عنوانات ان کے ذہن میں ہوں مگر وہ ابھی کسی ایک کے بارے میں فیصلہ نہ کرپائے ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس مضمون کو موجودہ شکل میں چھوڑ دیا اور اس کی اشاعت کو کسی اور وقت

کے لیے اٹھا رکھا اور پھر دیگر کاموں میں مصروف ہوجانے کی وجہ سے یہ مضمون تشنۂ تکمیل رہا۔ اب اس مضمون کو شائع کرتے وقت ہم نے اس کو اُسی شکل میں محفوظ کرلیا ہے جس میں یہ سبطِ حسن صاحب کے مسودے میں بہم ہے۔ البتہ مضمون کا عنوان ہم نے خود قائم کیا ہے یعنی 'الٰہ آباد سے اشک آباد تک — یادوں کا سفر'۔

بے جا نہ ہوگا کہ چند الفاظ اس مضمون کی دریافت کی بابت بھی درج کردیے جائیں۔ سبطِ حسن صاحب کا انتقال ۱۹۸۶ء کے اپریل میں ہوا۔ وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی تقریبات میں شرکت کے لیے ہندوستان گئے ہوئے تھے۔ وہیں انہوں نے اپنی بھرپور اور بامعنی زندگی کا سفر تمام کیا۔ سبطِ حسن صاحب کے انتقال کے بعد جب ان کے ذاتی کتب خانے کو ایک ریسرچ سینٹر کا روپ دینے کا فیصلہ ہوا تو ان کے احباب اور مجھ جیسے طالب علموں میں ذمہ داریوں کی تقسیم بھی عمل میں آئی۔ منجملہ بعض دیگر کاموں کے، مجھے سبط صاحب کے کاغذات کو سمیٹنے اور محفوظ کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ یہ کام خاصی حد تک ہوچکا تھا کہ ۱۹۸۷ء کے ستمبر میں مجھے ڈاکٹریٹ کے لیے برطانیہ جانا پڑا۔ البتہ اس خیال سے کہ کچھ نہ کچھ کام سبطِ حسن صاحب کے کاغذات کا بھی جاری رہے میں ان کے ان ادبی مضامین کو ساتھ لے گیا جو اس وقت تک تلاش کیے جاچکے تھے۔ ان میں سے کئی مضامین اخبارات اور ادبی رسائل میں بکھرے ہوئے تھے البتہ چند ایک ابھی غیر مطبوعہ تھے۔ خوش قسمتی سے کیمبرج میں مجھ کو اتنا وقت مل گیا کہ آئندہ دو تین برسوں میں سبط صاحب کے مضامین کے دو مجموعے 'افکارِ تازہ' اور 'ادب اور روشن خیالی' مرتب ہوگئے اور کراچی میں مکتبۂ دانیال سے شائع بھی ہوگئے۔ مگر اس کے بعد میں اس ضمن میں مزید کچھ کام خود اپنی ریسرچ میں مصروف ہوجانے کی بنا پر نہ کرسکا۔ ۱۹۹۳ء میں ملک واپسی پر یہاں کی دنیا بدلی ہوئی تھی۔ سبطِ حسن ریسرچ سینٹر بوجوہ ختم ہوچکا تھا۔ سبط صاحب کی کتابیں ایک دو اداروں کو بھجوا دی گئی تھیں۔ غالباً ان کے کچھ کاغذات تلف بھی ہوئے ہوں مگر ان میں سے بیشتر

کاغذات ان کی صاحبزادی نوشابہ زبیری صاحبہ کے پاس تھے مگر خود نوشابہ صاحبہ بھی اس دوران ایک افسوسناک ذاتی المیے سے گزر چکی تھیں۔ فصیح صاحب کا انتقال ان کے لیے جتنے بڑے صدمے اور بحران کی حیثیت رکھتا تھا اس میں سبط صاحب کے کاغذات کو بچا کر رکھنا بجائے خود بہت بڑی بات تھی البتہ ایک موقع پر طوفانی بارشوں نے جب ان کے بنگلے کی چھتوں سے کمروں کا رُخ کیا تو سبط صاحب کے کاغذات کے سوٹ کیس بھی اس کی زد میں آ گئے اور بہت سے کاغذات تلف ہو گئے۔ نوشابہ صاحبہ نے جب میرے ملک واپس آنے پر یہ سوٹ کیس میرے سپرد کیے تو بوسیدہ اور آب رسیدہ کاغذات میرے سامنے تھے۔ بہر حال ممکنہ احتیاط کے ساتھ ان کاغذات کو دھوپ دے کر اور ان کی شکنوں کو دور کر کے محفوظ کیا گیا، ان کاغذات کا بڑا حصہ سبط صاحب کی پچھلی کتابوں کے مسودوں، ان کے ہاتھ کے نوٹس اور ان کے نام آنے والے خطوں پر مشتمل تھا۔ ان میں بعض نامکمل چیزیں بھی تھیں اور بعض علمی منصوبوں کے خاکے (outlines) بھی۔ انہی کاغذات میں ایک رائٹنگ پیڈ کے ۳۹ صفحے ملے جن میں سبط صاحب نے سجاد ظہیر کے بارے میں اپنی یادیں تحریر کی تھیں۔ مضمون کے بعض حصے اُن کے اپنے خط میں نہیں تھے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے بعض حصے املا کی شکل میں لکھوائے تھے۔ املا کی شکل میں لکھی ہوئی تحریر پر جگہ جگہ انہوں نے اپنے قلم سے تصحیح بھی کی ہوئی تھی۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ یہ رائٹنگ پیڈ ۳۹ صفحات کے بعد ختم ہوگیا تھا۔ اس کے بعد کا مضمون کہاں لکھا گیا، اس کا کچھ اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ بہر حال کئی روز کی تلاش کے بعد سبط صاحب کے کاغذات میں ہی وہ بقیہ صفحے بھی کہیں یکجا اور کہیں منتشر صورت میں مل گئے اور یوں یہ مضمون اس مربوط شکل میں مرتب ہوگیا جس شکل میں یہ لکھا گیا تھا۔

سجاد ظہیر کے بارے میں سبط حسن صاحب نے اپنا یہ مضمون بڑے خلوص اور محبت کے ساتھ لکھا ہے۔ اس میں سجاد ظہیر کی دلنواز شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کیا گیا ہے۔

اس میں ان کی تنظیم سازی کی صلاحیتوں کا اور ان کے بے تکان کام کرنے کی اہلیت کا ذکر بھی ہے۔ سجاد ظہیر کے ادبی ذوق اور ان کے ادبی نظریات کی بھی اس میں وضاحت کی گئی ہے اور پھر کمیونسٹ پارٹی کے لیے انہوں نے جو کام کیا، اس پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ مگر قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ سبط حسن صاحب نے اس خوبصورت تحریر میں مدح سرائی سے بالکل کام نہیں لیا ہے۔ انہوں نے کمیونسٹ پارٹی (جس سے خود ان کا بھی گہرا تعلق تھا)، کے بعض غلط فیصلوں کا اعتراف بھی کیا ہے۔ کئی مواقع پر یہ پارٹی قیام پاکستان کے بعد ملک کے معروضی حالات کا درست طور پر ادراک نہ کرسکی اور ایسے انتہا پسندانہ فیصلوں کی مرتکب ہوئی جن کے فوری اور دوررس دونوں ہی طرح کے نتائج منفی شکل میں نکلے۔ سبط حسن صاحب نے پارٹی کی اس کوتاہ نظری کا اعتراف کیا ہے۔

سبط حسن صاحب کی یہ کتاب ایک ایسے موقع پر منظرِ عام پر آرہی ہے جبکہ پاکستان اور ہندوستان میں سجاد ظہیر کی پیدائش کی صد سالہ تقریبات منعقد ہورہی ہیں۔ سجاد ظہیر جو تقسیم سے پہلے ہندوستان میں اور تقسیم کے بعد پاکستان میں معتوب رہے، اب ان دونوں ملکوں میں منعقد ہونے والی صد سالہ تقریبات کا موضوع اور محور بن رہے ہیں۔ صد شکر کہ برصغیر میں اتنی تو اُن کی 'بحالی' ہوئی۔

آخر میں، میں ان تمام دوستوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے اس کتاب کی تدوین اور اشاعت کے دوران مختلف مرحلوں میں اپنا دستِ تعاون دراز کیا۔ سب سے زیادہ میں مرحوم حسن عابدی کا ممنونِ احسان ہوں جن کے مشورے ہمیشہ میرے شامل حال رہے۔ اس کتاب کا عنوان یعنی 'مغنیٔ آتش نفس، سجاد ظہیر' بھی حسن عابدی صاحب کا تجویز کردہ ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ وہ اس کتاب کو منصۂ شہود پر آتے ہوئے نہ دیکھ سکے ورنہ وہ یقیناً مسرت اور انبساط سے سرشار ہوتے کیونکہ سجاد ظہیر اور سبط حسن دونوں ہی ان کے ممدوح تھے جن کا وہ تمام عمر احترام سے ذکر کرتے رہے۔ میں انور شاہین صاحبہ کا بھی مشکور ہوں

جنہوں نے اس کتاب کے لیے سبط صاحب کے ایک انگریزی مضمون کا ترجمہ کیا۔ حوری نورانی صاحبہ کے تو وہ سب لوگ ممنون ہوں گے جو سبط حسن صاحب کی تحریروں سے شغف رکھتے ہیں۔ وہ اپنے والد ملک نورانی صاحب کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ملک میں ترقی پسند ادب کی اشاعت میں جس دلچسپی کا مظاہرہ کرتی ہیں وہ لائق تحسین ہے۔

یکم نومبر ۲۰۰۵ء، کراچی۔ ڈاکٹر سید جعفر احمد

الہٰ آباد سے اشک آباد تک —— یادوں کا سفر

میں کیا اور میرا غم کیا البتہ بنّے بھائی کی وفات سے ہم ایک بڑی ہی پیاری، نیک طینت اور دلکش شخصیت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہوگئے۔ وہ مشرقی تہذیب کا جوہر اور مغربی طرزِ فکر کا نہایت اعلیٰ پیکر تھے۔ اُن کی باتوں سے پیار اور محبت کی خوشبو آتی تھی۔

سجاد ظہیر یعنی بنّے بھائی سے پہلی بار میں الہ آباد میں ملا تھا اور آخری بار گیارہ مہینے گزرے اشک آباد میں۔ ۳۵ برس کی اس مختصر مدت میں دنیا کہاں سے کہاں پہنچی ہے۔ کتنے انقلاب آئے ہیں۔ کتنی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ انسان کے شعور و آگہی نے کتنی ترقی کی ہے۔ ایک تہائی سے زائد کرۂ ارض پر سوشلزم کا سرخ پرچم لہرا رہا ہے۔ بقیہ خطوں پر بھی زندگی کی قوتوں نے موت کے عفریت کو گھائل کر دیا ہے۔ اور وہ دفاعی جنگ لڑنے پر مجبور ہو رہا ہے۔ اُن سلطنتوں کا جاہ و حشم جن کی قلمرو میں آفتاب کبھی غروب نہ ہوتا تھا اب خاک میں مل چکا ہے۔ لوگوں کے سوچنے اور محسوس کرنے کے انداز بدل گئے ہیں۔ تہذیب اور ادب و فن کے معیار و اقدار بدل گئے ہیں، طرز بود و ماند میں فرق آ گیا ہے۔ اخلاق اور آدابِ زندگی اور مذاق و مزاج وہ نہیں رہے جو اَب سے ۳۵ سال پیشتر تھے۔ نئی نسل کو تو شاید ان بنیادی تبدیلیوں کا اندازہ نہ ہو کیوں کہ اب سے ۳۵ سال پہلے کی زندگی ان کے حسّی تجربوں کی

گرفت سے باہر ہے۔ اسی طرح جس طرح جلیاں والا باغ اور انقلابِ روس کے دَور کے حادثات ہمارے حِسّی تجربوں سے باہر تھے۔

مگر ذرا تصور کی آنکھوں سے اس دور کو دیکھیے تو آپ کو زندگی کا دوسرا ہی رنگ نظر آئے گا۔ اُس وقت پورا ایشیا اور پورا افریقہ بیرونی طاقتوں کا غلام تھا۔ چین اور کوریا پر جاپانی سامراجیوں کا قبضہ تھا۔ انڈوچین فرانس کے تصرّف میں تھا۔ انڈونیشیا میں ہالینڈ کی حکمرانی تھی۔ ملایا، برما، لنکا اور ہندوستان میں انگریزوں کا سکّہ چلتا تھا۔ مشرقِ قریب کے عرب ممالک برطانیہ کے زیرِاثر تھے۔ مصر اور سوڈان، وغیرہ بھی برطانیہ کے زیرِاثر تھے۔

الجزائر فرانس کی نوآبادی تھی اور لیبیا اور حبشہ مسولینی کی۔ غرضیکہ پورا ایشیا اور افریقہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ مگر غلامی کے وہ دن ہمیں اس وجہ سے عزیز ہیں کہ ان زنجیروں کی اگر ایک کڑی کہیں ہلتی تھی تو سب کڑیوں میں جنبش ہونے لگتی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ جب اسپین پر جنرل فرانکو نے اور حبشہ پر مسولینی نے حملہ کیا تھا تو ہمارے ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک غصے اور نفرت کی لہر دوڑ گئی تھی۔ ہمارے شاعروں اور ادیبوں میں کسی نے بھی نہ حبشہ دیکھا تھا نہ اسپین مگر اُن کو بڑا دکھ ہوا تھا اور انھوں نے اپنی دل کی چوٹ کا اظہار اپنی تخلیقوں میں کیا تھا اور آج دیکھتا ہوں کہ چلی میں فوجیوں نے صدر الاندے کی جمہوری حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ الاندے سمیت ہزاروں حریت پسند شہید ہوگئے لیکن ہمارے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی۔

سجاد ظہیر کو میں نے پہلی بار علی گڑھ میں دیکھا تھا۔ میری طالب علمی کے دن تھے۔ ایک روز شام کے وقت ہم کچھ دوست کرکٹ کے میدان میں کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ ادھر سے ڈاکٹر عبدالعلیم گزرے۔ ڈاکٹر علیم ان دنوں مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں مگر اُن دنوں شعبۂ عربی میں لکچرار تھے۔ اُن کے ساتھ انھیں کے ایک ہم عمر صاحب تھے جو صورت اور وضع قطع سے بالکل انگریز نظر آتے تھے۔ ہم نے سمجھا کوئی فرنگی دانش ور سیر

کے لیے آیا ہوگا۔

دوسرے دن اعلان ہوا کہ سید سجاد ظہیر بی اے آنرز آکسن بار ایٹ لا یونین میں طلبا سے خطاب کریں گے۔ ہم جلسے میں پہنچے تو دیکھا کہ وہی کل والے صاحب ڈائس پر بیٹھے پروفیسر احمد علی اور ڈاکٹر علیم سے گفتگو کر رہے ہیں۔ تقریر کا موضوع تو ذہن میں محفوظ نہیں البتہ اتنا یاد ہے کہ انھوں نے تقریر انگریزی میں کی تھی وہ بھی خالص آکسفورڈ کے لہجے میں۔ اور ہم لوگ ان کی شخصیت سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ ایک اور چیز بھی یاد رہی وہ ان کی یہودیوں کی سی ناک تھی۔ جب برسوں بعد بنّے بھائی سے بے تکلفی ہوگئی اور میں نے ان کی ناک والے واقعے کا ذکر کیا تو ہنس کر کہنے لگے کہ میاں اس ناک کے کارن کئی بار پٹتے پٹتے بچا ہوں۔ پھر برلن کا ایک واقعہ سنانے لگے کہ ہٹلر کو برسراقتدار آئے ابھی تھوڑے دن ہوئے تھے، برلن میں ہندوستانی طلبا کی Anti Imperialism کانفرنس ہو رہی تھی۔ میں ایک سڑک سے گزر رہا تھا۔ میرے ساتھ نواب زادہ امتیاز علی خاں اور کنور برجیش سنگھ اور ہتی سنگھ بھی تھے۔ اتنے میں نازی لونڈوں کا ایک گروہ ادھر سے گزرا۔ نازیوں نے میری ناک غور سے دیکھی اور سمجھے کہ میں یہودی ہوں۔ انھوں نے ہمیں گھیر لیا۔ میں ان کی اس حرکت پر بہت خفا ہوا لیکن کنور برجیش سنگھ بات کی تہہ تک پہنچ گئے۔ انھوں نے مجھ سے اردو میں کہا کہ دیکھو جرمن اور فرانسیسی مت بگھارنا ورنہ پٹ جاؤ گے۔ یہ لوگ تمھیں یہودی سمجھتے ہیں۔ بارے امتیاز اور کنور برجیش نے انھیں سمجھا دیا کہ بھائی ہم ہندوستانی طالب علم ہیں۔ یہودی نہیں ہیں تب بڑی مشکل سے جان بچی۔

دراز قد، کشادہ پیشانی، کتابی چہرہ، عینک کے پیچھے چمکتی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں، سر پر ڈھیروں بال، رنگ سرخ و سفید، ناک طوطے کی سی، آواز بھاری، رک رک کر بولنا، چال ڈھال بڑی باوقار، کھانا اس قدر آہستہ آہستہ کہ رسمی دعوتوں سے اکثر بھوکے اٹھنا۔ انگلیاں موسیقاروں کی سی مخروطی، مزاج میں بلا کی نفاست، دماغ روشن، قلب روشن، یہ تھے بنّے بھائی۔

سجاد ظہیر کو علی گڑھ سے گئے ہوئے ابھی چند ہفتے گزرے تھے کہ دفعتاً 'انگارے' کا شور بلند ہوا۔ 'انگارے' سجاد ظہیر، پروفیسر احمد علی، ڈاکٹر رشید جہاں اور محمود الظفر کے افسانوں کا مجموعہ تھا جو انہی دنوں لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔ علی گڑھ سے ان دنوں اردو کے دو ہفت روزہ اخبار شائع ہوتے تھے۔ ایک 'سرگذشت' دوسرے 'خشماف'، 'سرگذشت' میں زیادہ تر یونیورسٹی کی خبریں چھپتی تھیں البتہ 'خشماف' کا کام لوگوں کی پگڑی اچھالنا تھا۔ 'خشماف' دراصل خان بہادر مولوی ابو الخیر فصیحی کے نام کا مخفف تھا۔ یہ خان بہادر صاحب غازی پور کے رئیس اور ریاست گوالیار میں وزیر تھے۔ 'خشماف' کو خان بہادر صاحب سے نہ جانے کیا بیر تھا کہ وہ اٹھتے بیٹھتے ان کو صلواتیں سناتا اور ان کے خلاف مضامین شائع کرتا رہتا تھا۔ دوسرا خاندان جس پر اس کی خاص عنایت تھی خان بہادر شیخ محمد عبداللہ کا تھا۔ شیخ صاحب کے اجداد کشمیری برہمن تھے۔ شیخ صاحب سرسید احمد خان کے رفیق تھے۔ انھوں نے لڑکیوں کا کالج قائم کیا تھا جو مسلم یونیورسٹی سے ملحق تھا۔ شیخ صاحب نہایت روشن خیال بزرگ تھے۔ اُن کے گھر میں کوئی پردہ نہیں کرتا تھا اور انھوں نے لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی تھی۔ ان کی بڑی صاحبزادی خاتون عبداللہ کالج کی پرنسپل تھیں۔ ممتاز عبداللہ کالج میں استاد تھیں۔ تیسری بیٹی رشید جہاں ڈاکٹر تھیں، شاید پہلی مسلمان لیڈی ڈاکٹر۔ افسانے ڈرامے لکھتی تھیں اور ولایت سے حال ہی میں لوٹی تھیں۔ خورشید اور برجیس کالج میں پڑھتی تھیں اور محسن عبداللہ اکلوتا بیٹا میرا ہم جماعت تھا۔

'خشماف' تو اس خاندان کا جانی دشمن تھا۔ 'انگارے' کا ذکر ہم نے سب سے پہلے اسی 'خشماف' میں پڑھا۔ 'انگارے' کہانیوں کا ایک مختصر سا مجموعہ تھا۔ اس میں کہانیاں سجاد کی تھیں، پروفیسر احمد علی کی، ڈاکٹر رشید جہاں کی اور ان کے شوہر محمود الظفر کی۔ اس مجموعے کا شائع ہونا تھا کہ اردو کے رجعت پرست حلقوں میں تہلکہ مچ گیا۔ لکھنؤ میں مولانا عبدالماجد دریابادی نے اور علی گڑھ میں 'خشماف' نے آسمان سر پر اٹھالیا۔ کبھی مصنفوں کو قتل کرنے کی

دھمکیاں دی جاتیں کبھی حکومت سے مطالبہ ہوتا کہ اسے ممنوع قرار دیا جائے۔ 'خشماف' اس مقدس مہم میں پیش پیش تھا۔ یوں تو کوئی ایسی گالی نہ تھی جس سے مصنفوں کو نوازا نہ گیا ہو اور کوئی ایسی تہمت نہ تھی جو دَھری نہ گئی ہو لیکن شیخ عبداللہ کے خاندان کو خاص طور پر ہدف ملامت بنایا گیا تھا۔ 'خشماف' نے باقاعدہ ایک نمبر نکالا جس کا عنوان تھا آگ کھائیں انگارے ...... اور یہ عنوان مسلسل کئی مہینے تک جاری رہا۔ انھیں دنوں ہماری ملاقات ڈاکٹر رشید جہاں سے ہوئی۔

قصہ یہ ہوا کہ اختر حسین رائے پوری اور میں ایک ہفت روزہ 'پیام' کے نام سے شائع کرتے تھے۔ مقصد تھا یونیورسٹی کے طلبا کے حقوق اور ان کی شکایتوں کو یونیورسٹی کے منتظمین تک پہچانا۔ 'انگارے' کا ہنگامہ جب بہت بڑھا تو ہم لوگوں نے اس کی حمایت میں ایک طویل تبصرہ لکھا اور مخالفین کی الزام تراشیوں کا منہ توڑ جواب دیا۔ یہ تبصرہ ڈاکٹر رشید جہاں کی نظر سے بھی گزرا۔ چنانچہ ایک روز محسن عبداللہ نے مجھ سے کہا کہ چلو تمھیں اور اختر کو رشیدہ آپا نے بلایا ہے۔ ہم لوگ محسن کے ساتھ شیخ عبداللہ کی کوٹھی پر گئے اور ابھی ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہی تھے کہ اندر کا دروازہ کھلا اور ایک نہایت حسین و جمیل خاتون کمرے میں داخل ہوئیں۔ وہ سفید سوتی ساڑی پہنے ہوئے تھیں۔ ان کے گھنگھرالے بال شانوں تک پھیلے ہوئے تھے اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہم دونوں کو بڑی حیرت سے دیکھ کر ہنس رہی تھیں۔ یہ ڈاکٹر رشید جہاں تھیں۔ میں نے اس وقت تک اتنی خوش رو اور خوش اندام عورت کبھی نہیں دیکھی تھی اور شاید اختر کا تجربہ بھی اسی قسم کا تھا۔ ہم دونوں کے منہ حیرت سے کھلے ہوئے تھے اور ہم ایک سکتے کے عالم میں ان کے سامنے کھڑے تھے۔ وہ نہایت بے تکلفی سے آگے بڑھیں اور اختر کی طرف انگلیوں سے اشارہ کرکے پوچھا تمہارا کیا نام ہے۔ اختر نے نام بتایا تو میری طرف مخاطب ہوکر کہنے لگیں تو پھر تم سبط حسن ہوگے۔ میں نے کہا جی ہاں، انھوں نے کھڑے کھڑے وہیں سے چیخ کر نوکر کو پکارا اور چائے کا حکم دے دیا۔ پھر وہ ہماری

طرف مخاطب ہوئیں اور انھوں نے اس بے تکلفی سے گفتگو شروع کی گویا ہم سے برسوں کی ملاقات ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کو نہ اپنے حسن کا احساس تھا اور نہ ہمارے اجنبی ہونے کا اور جب انھوں نے باتیں شروع کیں تو پھر کرتی ہی چلی گئیں۔ ہم لوگ بیچ بیچ میں بس جی ہاں، جی نہیں کہتے رہے۔

دو تین گھنٹے کے بعد جب ہم دونوں واپس لوٹے تو ہمیں یقین ہوگیا کہ یہ بڑی دبنگ خاتون ہیں۔ اور ان کو نہ تو کوئی اپنے اصول سے ہٹا سکتا ہے اور نہ ناک کاٹنے اور قتل کی دھمکی دے کر ڈرا سکتا ہے۔

'انگارے' کا طوفان کچھ عرصے کے بعد خود بہ خود ختم ہوگیا۔ بات آئی گئی ہوئی۔ میں بمبئی اور پھر اس کے بعد حیدر آباد چلا گیا اور قاضی عبدالغفار کے ساتھ اخبار 'پیام' میں کام کرنے لگا۔ اس اثنا میں برطانوی ہند میں صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہوئے اور یو پی میں کانگریس کی وزارت قائم ہوگئی۔ ایک دن مجھے ڈاک سے ایک خط موصول ہوا۔ کھولا تو وہ سجاد ظہیر کا خط تھا۔ اس خط میں انھوں نے لکھا تھا کہ میں نے تمہارا ذکر ڈاکٹر ارشد سے سنا اور تمہارے کچھ مضامین بھی دیکھے اسی لیے تمہیں لکھ رہا ہوں کہ تم ڈاکٹر یوسف حسین خان پروفیسر جامعہ عثمانیہ سے ملو اور ان کی نگرانی میں انجمن ترقی پسند مصنّفین کی کوئی شاخ حیدر آباد میں بھی قائم کرو۔ خط کے ہمراہ انجمن کا اعلان نامہ بھی تھا۔ میں نے وہ خط اور اعلان نامہ قاضی عبدالغفار، اختر حسین رائے پوری، مخدوم محی الدین اور دو چار دوسرے دوستوں کو دکھایا۔ سب نے اس اعلان نامہ سے اتفاق کیا البتہ ڈاکٹر یوسف حسین خان کے بارے میں سبھی کو شبہ تھا اور اس بات پر حیرت تھی کہ سجاد ظہیر نے ڈاکٹر یوسف حسین خان کو ترقی پسند کس بنیاد پر پسند کیا ہے۔ چنانچہ میں نے بنّے بھائی کو پوری روداد لکھ بھیجی اور ڈاکٹر یوسف حسین کے بارے میں اپنے شبہات سے ان کو آگاہ کردیا۔ بنّے بھائی نے لکھا کہ میں یوسف حسین سے پیرس میں ملتا رہتا تھا۔ اس وقت تو وہ بڑے روشن خیال دانشور سمجھے جاتے تھے لیکن ممکن ہے

کہ حیدر آباد کے حالات نے انھیں اپنی روش بدلنے پر مجبور کردیا ہو۔ لہٰذا تم لوگوں کو اختیار ہے ان سے مشورہ کرو یا نہ کرو۔ ہم لوگوں نے مسز سروجنی نائیڈو کی صدارت میں انہی کی کوٹھی پر انجمن ترقی پسند مصنفین کا افتتاحی جلسہ کیا۔ اس جلسے میں مشکل سے بارہ تیرہ آدمی ہوں گے۔ قاضی عبدالغفار، اختر حسین، مخدوم، شہاب، 'رعیت' کے ایڈیٹر نرسنگھ راؤ، مسز نائیڈو کے سب سے بڑے بیٹے، ڈاکٹر جے سوریا نائیڈو جو یورپ میں نئے نئے بھائی کے ساتھ تھے اور مسز نائیڈو کی دونوں بیٹیاں مس لیلی منی جو آکسفورڈ یونیورسٹی سے پڑھ کر آئی تھیں اور لڑکیوں کے سرکاری کالج میں پروفیسر تھیں اور مس پدما جا، جن کو اردو اور فارسی ادب سے اتنی ہی محبت تھی جتنی بلبل ہند سروجنی نائیڈو کو۔

سن ۳۷ء کے موسم سرما میں میں وطن جارہا تھا کہ الہ آباد سے ڈاکٹر اشرف کا خط آیا۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑی شفقت سے مجھے لعنت ملامت کی تھی کہ تم حیدر آباد میں وقت ضائع کررہے ہو حالانکہ یہاں نشر و اشاعت کے بہت کام ہیں۔ میں نے انھیں لکھا کہ میں وطن جاتے ہوئے واپسی پر آپ سے ملوں گا تو مفصل بات چیت ہوگی۔

میں لکھنؤ پہنچا اور خیال تھا کہ ایک دو روز وہاں رہ کر گھر چلا جاؤں گا۔ مگر مجاز نے کہا کہ میں الہ آباد جارہا ہوں، وہاں اسٹوڈنٹ فیڈریشن کی ایک کانفرنس ہے اور مشاعرہ بھی ہے، تم بھی چلو۔ میں نے کہا چلو۔ چنانچہ ہم نے ڈاکٹر اشرف کو تار دے دیا اور دوسرے دن الہ آباد پہنچ گئے۔ وہیں میری ملاقات علی سردار جعفری سے ہوئی جس کا ذکر میں 'شہر نگاراں' میں کرچکا ہوں۔ دن تو خیر ڈاکٹر اشرف کے ساتھ گزرا لیکن ہم تینوں نے طے کیا کہ شام کو ہریندر چٹو پادھیہ کا تہذیبی تماشہ دیکھیں گے۔ ہریندر چٹو پادھیہ مسز سروجنی نائیڈو کے بھائی تھے۔ انگریزی میں شعر اور ڈرامے لکھتے تھے اور رقص اور موسیقی کے پروگرام ترتیب دیتے تھے۔ ان دنوں وہ اپنے طائفے کو لے کر الہ آباد آئے ہوئے تھے۔ سردار اور میں یہ تہذیبی پروگرام دیکھنے پہنچے اور ٹکٹ خرید رہے تھے کہ اتنے میں کسی نے مجاز کو آواز دی۔ مجاز! ارے

تم کب آئے؟ یہ بنّے بھائی تھے۔ وہ مجاز اور سردار سے بغلگیر ہوئے اور مجاز نے تعارف کرایا کہ یہ سجاد ظہیر ہیں اور یہ سبط حسن ہیں۔ ان کو دیکھ کر مجھے معاً علی گڑھ یاد آ گیا، لیکن یہ سجاد ظہیر وضع قطع میں علیگڑھ کے سجاد ظہیر سے بالکل مختلف تھے۔ کھدر کا کرتہ، کھدر کا پائجامہ، پاؤں میں چپل اور شالی چادر اوڑھے ہوئے۔ بڑے پیار سے ملے، گلے لگایا اور رضیہ آپا سے ملایا۔ حیدر آباد کے حالات پوچھے اور پانچ منٹ کے اندر میرے بارے میں سب کچھ پوچھ لیا۔ کہاں کے رہنے والے ہو، باپ کا کیا نام ہے، کتنے بھائی بہن ہیں، شادی ہوئی ہے یا نہیں۔ میں نے جب اپنے باپ اور اپنے گاؤں کا نام بتایا تو کہنے لگے ارے تم تو بوبو کے بھی رشتے دار ہو اور بابا کے بھی۔ میں نے کہا کہ صاحب آپ لوگ بڑے آدمی ہیں، آپ سے رشتے داری جتانا کچھ مناسب بات نہیں ہے۔ وہ ہنسنے لگے۔ اور کہنے لگے کہ بھئی ہمارا اس طبقے سے تعلق تو ہے البتہ کوشش کر رہے ہیں کہ اس کے اثر سے نکل جائیں اور اس کو بے دخل کر دیں۔ اس پر رضیہ آپا مسکرا کر بولیں کہ ہاں دن بھر ریلوے مزدوروں میں کام کرتے ہیں اور رات کو سول لائن میں سروزیرحسن کی کوٹھی میں آرام فرماتے ہیں۔ اس پر بنّے بھائی کے چہرے کا رنگ سرخ ہو گیا مگر وہ ضبط کر کے ہنسنے لگے۔ بھئی درمیانہ طبقے کا یہ تضاد تو ہے جس سے لینن بار بار انقلابیوں کو آگاہ کرتا رہتا تھا۔ لیکن ہم کون سے انقلابی ہیں۔ بس لہو لگا کر شہیدوں میں شامل ہو گئے ہیں۔ البتہ شہیدوں میں شامل ہونا غداروں کی صف میں شامل ہونے سے تو بہتر ہی ہے۔ اتنے میں گھنٹی بجی اور ہم لوگ ایک ساتھ تماشہ دیکھنے ہال میں داخل ہو گئے۔ نو بجے کے قریب تماشا ختم ہوا تو بنّے بھائی نے کہا کہ چلو ہمارے ساتھ تم لوگوں کو اچھا سا کھانا کھلائیں گے۔ سردار جعفری ایک اکھڑ آدمی، وہ کڑک کر بولے کہ جناب یہاں سے تو ہم آپ کی موٹر میں سول لائن جائیں گے لیکن واپسی میں گیارہ بارہ بجے ہمیں وہاں کون سی سواری ملے گی۔ نہ صاحب میں یہ پانچ چھ میل پیدل چلنے کے لیے بالکل تیار نہیں ہوں۔ میں نے اور مجاز نے بہت سمجھا بجھا کر سردار کو راضی کیا۔ میں نے کہا بھائی میں

اس شہر میں چار سال رہ چکا ہوں سول لائن میں ہر سنیما گھر کے پاس یکے تانگے مل جاتے ہیں، ایسی تن آسانی بھی کیا، سروزیر حسن کی کوٹھی کچھ دور نہ تھی اس لیے ہم لوگ پیدل ہی چل پڑے۔ راستے میں رضیہ آپا ایک بگڑے نواب کا قصہ سنانے لگیں کہ موصوف قرض پر زندہ تھے لیکن ایک عدد ملازم ضرور ساتھ چلتا تھا۔ ایک دن نواب صاحب نے دکان سے ایک آنے کی ریوڑیاں خریدیں۔ اتفاق سے ایک ریوڑی زمین پر گر پڑی۔ نوکر نے لپک کر اٹھائی اور نواب صاحب کو پیش کی تو نواب صاحب نے کہا تم کھالو، پھر قدرے توقف کر کے بولے ہمارے ساتھ رہو گے تو یونہی عیش کرائیں گے۔ مطلب صاف تھا۔ سردار جعفری نے چپکے سے کہا، شیرنی نو گرفتار ہے، ذرا سنبھل کر رہنا ورنہ پنجہ مار دے گی۔ رضیہ آپا کے انداز ہی سے ہمیں پتہ چل گیا تھا کہ وہ ساس سسر کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتیں اور اس میں وہ حق بجانب تھیں۔ کون پڑھی لکھی عورت دوسروں کی دست نگر ہو کر رہنا چاہے گی۔ مگر مشکل یہ تھی کہ بنے بھائی نے سیاست اور ادب سے کل وقتی پیمانِ وفا باندھ لیا تھا حالانکہ وہ بی اے آنرز اور بیرسٹری کر کے آئے تھے۔ چاہتے تو یونیورسٹی میں پڑھاتے یا وکالت کرتے۔ سروزیر حسن حال ہی میں چیف ججی سے ریٹائر ہوئے تھے اور ان کی ماہانہ آمدنی کچھ نہیں تو اس وقت کے پانچ چھ ہزار سے کم نہ تھی۔ بنے بھائی باپ کے ساتھ نتھی ہو جاتے تو ہزار دو ہزار تو کما ہی لیتے۔ خیر صاحب ہم لوگ سروزیر حسن کی کوٹھی پر پہنچے اور میں پہلی بار سروزیر حسن اور لیڈی وزیر حسن سے وہیں ملا۔

بنے بھائی جس خلوص، جس پیار اور بے تکلفی سے ملے اس نے مجھے اسی رات ان کا گرویدہ بنا دیا۔ وہ کبھی سیاسی مسائل پر گفتگو کرتے، کبھی آرٹ پر، کبھی ادب پر اور میں سوچتا کہ کتنی پہلو دار ہے یہ شخصیت اور اس کا جمالیاتی ذوق۔ اتنی مٹھاس تھی ان کی گفتگو میں اور میں اتنا مسحور تھا ان کی باتیں سن کر گویا ان کی زبان سے الفاظ نہیں بلکہ انگوری شراب کے چشمے بہہ رہے تھے۔

پھر جب میں لکھنؤ آیا اور مجاز اور سردار کے ساتھ مل کر 'نیا ادب' جاری کیا تو بنے بھائی سے تقریباً ہر مہینے دو مہینے کے بعد ملاقاتیں ہونے لگیں۔ وہ کبھی ہفتے دو ہفتے کے لیے لکھنؤ آتے تو ہم لوگ ان کے ساتھ گھنٹوں بیٹھتے اور طرح طرح کے منصوبے بناتے رہتے۔ کبھی میں کسی کام سے الہ آباد جاتا تو زیادہ وقت انہی کے ساتھ بسر کرتا اور 'نیا ادب' سے تو انھیں ذاتی لگاؤ تھا۔ وہ ہمارے چلتے پھرتے ایجنٹ تھے۔ جس شہر میں جاتے وہاں سے دس بیس خریداروں کا چندہ بھیج دیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ قریب قریب ہر اشاعت میں ان کا کوئی نہ کوئی مضمون ضرور شائع ہوتا۔ ایک بار انھوں نے ہمیں منشی پریم چند کے تقریباً دو تین درجن خطوط اشاعت کے لیے بھیجے۔ ان خطوط میں منشی جی نے انجمن ترقی پسند مصنفین کے تنظیمی مسائل کا ذکر کیا تھا اور کہیں کہیں اس کے مقاصد کے بارے میں بنے بھائی سے سوالات کیے تھے۔

انہی دنوں بنے بھائی کا ایک ناول یا طویل مختصر افسانہ 'لندن کی ایک رات' شائع ہوا۔ یہ ناول سجاد ظہیر نے لندن سے ہندوستان واپس آتے ہوئے لکھا تھا۔ اس ناول میں لندن میں مقیم خوشحال ہندوستانی طلبا کی ذہنی اور جذباتی کشمکش کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ 'لندن کی ایک رات' واقعاتی ناول نہیں بلکہ تاثراتی ناول ہے۔ اس میں نہ کوئی ہیرو ہے نہ ہیروئن، بس کچھ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ہیں جو شام کے وقت ایک کمرے میں جمع ہوتے ہیں۔ ناچتے گاتے ہیں، ریکارڈ بجاتے ہیں، شرابیں پیتے ہیں اور بحثیں کرتے ہیں۔ اور ان تمام بحثوں کا رخ شعوری یا غیر شعوری طور پر کالے گورے کے فرق اور ہندوستان کے سیاسی حالات کی طرف مڑ جاتا ہے۔ زمان اور مکان کے اس تنگ دائرے میں ظاہر ہے نہ تو کردار کا ارتقاء دکھایا جا سکتا تھا اور نہ واقعات کسی فیصلہ کن انجام تک پہنچ سکتے تھے۔ آتش دان کے گرد شعلوں کی روشنی میں تو وہی سب کچھ ہو سکتا ہے جس کا نقشہ سجاد ظہیر نے کھینچا ہے۔ اس ناول کے کردار دراصل افراد نہیں ہیں بلکہ ہر فرد درمیانہ طبقے کے ہندوستانی نوجوانوں کے کسی نہ کسی

گروہ کے مزاج، آدرش اور طرز فکر و احساس کی نمائندگی کرتا ہے۔ عارف آئی سی ایس کے امتحان کی تیاریاں کررہا ہے اور اپنے آپ کو صاحبانِ عالیشان کے سانچے میں ڈھالنے کی فکر میں ہے۔ نعیم ذہنی اور جسمانی سستی کا شکار ہے، وہ دو تین برس کے لیے گیا تھا لیکن پانچ چھ برس گزر گئے ہیں مگر وہ اب تک ڈگری نہیں لے سکا ہے اور نہ آئندہ کوئی امید ہے۔ راؤ نہایت زندہ دل، ذہین اور عاشق پیشہ نوجوان ہے، ہندوستان کے سیاسی اور سماجی مسائل سے بخوبی واقف ہے۔ عوام کی پستی اور زبوں حالی پر اُسے دکھ بھی ہوتا ہے مگر وہ کوئی عملی قدم اٹھانے کے لیے آمادہ نہیں ہے۔ خاں صاحب فقط رئیس زادے ہیں، انھیں شراب پینے اور پکاڈلی کی شب بیدار لڑکیوں کے علاوہ کسی چیز سے دلچسپی نہیں ہے۔ کریمہ بیگم کے اندر خواہشوں کا طوفان برپا ہے۔ لیکن وہ ان خواہشوں کو کچلتی رہتی ہیں۔ ان کا جی پیار، محبت کو چاہتا ہے مگر انھوں نے ہندوستانی عفت و حیاء کا ایک ایسا ڈراؤنا برقعہ اوڑھ رکھا ہے کہ مرد ان کے قریب جاتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ لہٰذا وہ انگریز لڑکیوں سے جو ہندوستانی مردوں سے ملتی جلتی رہتی ہیں سخت نفرت کرتی ہیں۔ احسان سوشلسٹ ہے اور وہ ہر پھر کر مزدوروں اور کسانوں کا ذکر کرتا ہے لیکن اس ناول کی سب سے دلکش شخصیت شیلا گرین کی ہے وہ ایک انگریز لڑکی ہے۔ نہایت آزاد خیال۔ وہ مردوں سے بالکل مساوی سطح پر ملتی ہے۔ اور اس کو اپنے عورت ہونے کا احساس نہیں ہوتا۔ وہ دن کو کسی دفتر میں کام کرتی ہے اور رات کو یونیورسٹی میں پڑھتی ہے۔ وہ راؤ کی دوست ہے۔ لیکن وہ راؤ کے عاشقانہ فقروں پر نہ خفا ہوتی ہے، نہ ناک بھوں چڑھاتی ہے، بلکہ ہنس دیتی ہے۔ اسے نعیم اچھا لگتا ہے مگر اس پسندیدگی میں جنس کو بالکل دخل نہیں ہے۔ اسے ایک بنگالی ڈاکٹر سے محبت ہے جو سال بھر ہوا وطن واپس چلا گیا ہے اور وہاں کی سیاسی جدوجہد میں شریک ہے۔ پہلے اس کے خط بڑی باقاعدگی سے آتے تھے لیکن چھ مہینے سے اس کی کوئی چٹھی نہیں آئی اور شیلا کو ڈر ہے کہ کہیں وہ گرفتار تو نہیں ہوگیا۔

محفل برخاست ہوگئی۔ احباب اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے لیکن نعیم اور شیلا بیٹھے باتیں کرتے رہے اور جب شیلا اپنی داستانِ غم سنا چکی تو آسمان کے کونے سے تاریکی کے پردوں کو پھاڑ کر روشنی جھانک رہی تھی۔ یہ روشنی روشن مستقبل کی بشارت تھی۔ شیلا نے اپنا کوٹ جلدی سے پہنا اور نعیم سے ہاتھ ملا کر تیزی سے باہر نکل گئی۔ نعیم چپ چاپ اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اور بڑی دیر تک یوں ہی بیٹھا رہا۔ آگ بجھ گئی تھی اور صبح کا پھیکا سفیدہ چور کی طرح کھڑکی کے راستے دبے قدموں اندر آ رہا تھا۔

بنّے بھائی لندن ہی میں کمیونسٹ تحریک سے وابستہ ہو چکے تھے۔ لیکن ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹی خلافِ قانون جماعت تھی اس لیے وہ یہاں آ کر کانگریس سوشلسٹ پارٹی میں شامل ہوگئے۔ کانگریس سوشلسٹ پارٹی دراصل کانگریس کا ایک بایاں بازو تھی۔ اس جماعت کو پنڈت جواہر لال نہرو کی سرپرستی حاصل تھی البتہ پنڈت جی خود اس جماعت میں کبھی شریک نہیں ہوئے۔ کانگریس سوشلسٹ پارٹی کے جنرل سیکریٹری مسٹر جے پرکاش نرائن تھے۔ انھوں نے امریکہ میں تعلیم پائی تھی۔ بہار کے رہنے والے تھے اور بڑے امن پسند اور نرم رو انسان۔ ان کے رفیقوں میں اچاریہ نریندر دیو، پنڈت سمپورنانند، ڈاکٹر رام منوہر لوہیا، اچیوت پٹور دھن اور دوسرے نوجوان دانشور تھے جو یورپ اور برطانیہ سے تعلیم پا کر لوٹے تھے۔ یہ سب لوگ سجاد ظہیر کے ذاتی دوست تھے۔ البتہ جے پرکاش نرائن سے سجاد ظہیر کا بڑا یارانہ تھا شاید اس وجہ سے کہ دونوں کی طبیعتیں ایک دوسرے سے بہت ملتی تھیں لیکن کانگریس سوشلسٹ پارٹی بنیادی طور پر انقلابی پارٹی نہیں تھی۔ اس کا کردار انگلستان کی لیبر پارٹی اور فرانس اور جرمنی کی سوشلسٹ پارٹیوں سے ملتا جلتا تھا۔ طبقاتی جدوجہد اور پرولتاریہ طبقے کی رہنمائی میں سماجی انقلاب ان کے فکر و عمل کے دائرے سے خارج تھے۔ یہ جماعت ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کے (جو خفیہ طور پر کام کرتی تھی) سخت خلاف تھی۔ سجاد ظہیر خفیہ طور پر کمیونسٹ پارٹی کے رکن تھے اور الہ آباد کی ریلوے مزدوروں کی یونین میں کام کرتے

تھے۔ البتہ سیاسی سرگرمیوں کو وسعت دینے کی خاطر وہ کانگریس سوشلسٹ پارٹی کے جلسے جلوسوں میں شریک ہوتے تھے۔ پنڈت جواہر لعل نہرو سے ان کے خاندانی تعلقات تھے۔ ان کے والد سروزیر حسن اور پنڈت جی کے والد پنڈت موتی لال نہرو نہ صرف ہم پیشہ اور ہم مشرب تھے بلکہ دونوں میں بڑی دوستی تھی۔ دونوں کا مزاج جاگیر دارانہ تھا اور جاگیر دارانہ تہذیب میں وضع داری، میل جول اور رکھ رکھاؤ بہت اہمیت رکھتے تھے۔ یوں بھی پنڈت جواہر لال نہرو بنّے بھائی کو بہت پسند کرتے تھے۔ کیونکہ پنڈت جی کی طرح بنّے بھائی بھی مردِ یک فنی نہیں تھے بلکہ مغربی اور مشرقی ادب، موسیقی، مصوری، رقص، ڈرامہ، فلم بھی چیزوں کا بہت اچھا مذاق رکھتے تھے۔ اور یہ شوق تمام عمر ان سے نہ چھوٹ سکا۔ چنانچہ پنڈت جی نے جب آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے صدر دفتر کی ازسرِ نو تنظیم کی تو انھوں نے ملک کے سبھی ممتاز نوجوان دانشوروں کو اپنا شریک کار بنا لیا تھا۔ نئے نئے شعبے کھولے گئے اور طباعت اور اشاعت کے لیے چوڑے منصوبے بنائے گئے۔ کوئی شعبہ ڈاکٹر محمد اشرف کے سپرد ہوا، کوئی ڈاکٹر زین العابدین کے، کوئی ڈاکٹر رام منوہر لوہیا کے۔ اسی دوران میں بنّے بھائی اور ڈاکٹر زیڈ اے احمد نے سوشلسٹ لٹریچر کے لیے ایک الگ اشاعت گھر بھی قائم کیا، اس لیے کہ کمیونسٹ اور سوشلسٹ لٹریچر کی درآمد ہندوستان میں ممنوع تھی، بس یورپ سے کبھی کبھار کوئی شخص چھپے چوری مارکس، اینگلز اور لینن وغیرہ کی کتابیں لے آتا تو اسے سائیکلو اسٹائل کر کے چپکے چپکے تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ اس سوشلسٹ دارالاشاعت کی ایک کتاب میرے ذہن میں اب تک محفوظ ہے اور وہ تھی کارل مارکس کے خطوط۔ یہ کارل مارکس کے وہ مضامین تھے جو اس نے ۱۸۵۶ء، ۵۷ء اور ۵۸ء میں ہندوستان کے بارے میں 'نیویارک ٹریبون' میں لکھے تھے۔ مارکس اس اخبار کا نامہ نگار تھا۔ چنانچہ ہندوستان میں جب بغاوت شروع ہوئی تو کارل مارکس تقریباً دو سال تک ہر ہفتے ہندوستان کے سیاسی و معاشی حالات پر تبصرہ لکھ کر لندن سے نیویارک بھجواتا رہا۔ ان خطوط کی مکمل نقل میرے پاس محفوظ ہے لیکن افسوس ہے

کہ اب تک ان کی اشاعت کی نوبت نہیں آئی ہے۔

الہ آباد کے سوشلسٹ دارالاشاعت نے صرف وہ مضامین چھاپے تھے جن میں کارل مارکس نے برطانوی سامراج کے اثرات سے بحث کی تھی اور یہاں کے سماجی اور معاشی حالات کا اصولی جائزہ لیا تھا۔

انھیں دنوں انجمن ترقی پسند مصنفین کی صوبائی کانفرنس لکھنؤ میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس کے روحِ رواں تو بنے بھائی ہی تھے لیکن کانفرنس میں شریک ہونے والوں میں صوبے کے قریب قریب ہندی اور اردو کے سبھی ممتاز ادیب تھے۔ اس کانفرنس کا مجھے ایک چھوٹا سا واقعہ یاد آتا ہے جس کا تعلق مجاز کی ذات سے ہے۔ ہمارے دوست حیات اللہ انصاری انجمن ترقی پسند مصنفین کے سرگرم رکن تھے۔ لیکن تھے وہ خالص گاندھی وادی، انھوں نے ایک کہانی 'کالا دیو' کے عنوان سے لکھی تھی۔ یہ ایمائی کہانی اسی مہینے 'نیا ادب' میں چھپی تھی۔ کانفرنس کے دن سجاد ظہیر، رضیہ سجاد ظہیر، سردار جعفری، مجاز اور میں ڈائس کے پاس کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ اتنے میں ہم نے دیکھا کہ حیات اللہ انصاری ہال میں داخل ہوئے۔ کھدر کی شیروانی، چوڑی دار پاجامہ اور سر پر سولا ہیٹ۔ ان کے چلنے کا انداز اور وضع قطع ایسی ہوئی تھی کہ خواہ مخواہ ہنسنے کو جی چاہتا تھا۔ انھوں نے ہم لوگوں کو ایک جگہ کھڑے دیکھا تو مسکراتے ہوئے ہمارے پاس آ گئے۔ علیک سلیک ہوئی، لیکن وہ اس وقت تک رضیہ آپا سے نہیں ملے تھے اور بنے بھائی بھی باتوں میں ایسے محو ہوئے کہ بیوی کا تعارف کرانا بھول گئے۔ رضیہ نے مجاز سے چپکے سے پوچھا کہ یہ کون صاحب ہیں، بس پھر کیا تھا مجاز کو تو مذاق کرنے کا بہانہ چاہیے تھا۔ بڑی سنجیدگی سے کہنے لگا ارے آپ ان سے واقف نہیں ہیں، یہ ہیں مولوی حیات اللہ فرنگی محلی مصنف 'کالا دیو' یہ سننا تھا کہ رضیہ آپا نے زور کا قہقہہ لگایا اور ہنستے ہنستے صوفے پر بیٹھ گئیں۔ حیات اللہ کو مجاز کی اس ناشائستہ حرکت پر بہت غصہ آیا اور وہ فوراً بلا کچھ کہے سنے تیز تیز قدموں سے ہال کے باہر چلے گئے۔ کچھ دیر تک تو ہم لوگوں

کو معاملے کی سنگینی کا احساس ہی نہیں ہوا اس لیے کہ ہر شخص مجاز کے فقرہ پر ہنس رہا تھا لیکن جب ہنسی رکی تو اندازہ ہوا کہ حیات اللہ تو خفا ہوکر واک آؤٹ کر گئے ہیں۔ اب سوال یہ تھا کہ ان کو منانے کون جائے۔ مجاز نے کہا میں جاتا ہوں ان سے معافی مانگوں گا اور ساتھ لے آؤں گا۔ بنے بھائی نے کہا نہیں تم نے سخت گڑبڑ کی ہے اور تم وہاں جاکر پھر کوئی شرارت کرو گے۔ انھوں نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا مطلب یہ تھا کہ تم چلی جاؤ مگر وہ تو ہنسی کے مارے لوٹی جارہی تھیں۔ آخر بنے بھائی نے سردار جعفری کو ساتھ لیا اور فرنگی محل روانہ ہوئے۔

شام کے وقت جب جلسہ برخاست ہوا تو ہم لوگوں نے بنے بھائی سے فرنگی محل کی روداد سنی۔ کہنے لگے یار یہ حیات اللہ بھی ایسا اڑیل ٹٹو ہے کہ کسی طرح سے ہلتا ہی نہیں تھا۔ اور شکایت کا ایک دفتر تھا کہ ختم ہی ہونے کو نہ آتا تھا۔ اس نے تم لوگوں کی ایک ایک شرارت مجھے بتائی ہے۔ وہ نظیر آباد میں تنبولن کی دکان پر پان کھانے جاتا ہے تو تم لوگ اس پر فقرے چست کرتے ہو۔ وہ دھوپ سے بچنے کے لیے سولا ہیٹ پہنتا ہے تو اس کی یہ ادا تم لوگوں کو پسند نہیں آتی۔ تم لوگ اس کے گھر پر جاکر چائے پیتے ہو، کھانا کھاتے ہو۔ اخبار پڑھتے ہو لیکن احسان ماننے کے بجائے تم لوگ شراب کی ترنگ میں سڑک پر کھڑے ہوکر فریاد رس الٰہی، فریاد رس الٰہی کے نعرے لگاتے ہو۔ ہم لوگ ہنسنے لگے تو بنے بھائی نے پوچھا کہ بھائی یہ فریاد رس الٰہی کیا بلا ہے۔ ہم نے کہا آپ نے انھی سے پوچھا ہوتا۔ کہنے لگے میرا جی تو چاہا لیکن سردار جعفری نے اشارے سے منع کر دیا۔ ہم نے کہا کہ حیات اللہ کے والد پر آخر عمر میں جنون کے دورے پڑنے لگے تھے اور وہ سڑک پر چلتے چلتے یہی نعرہ لگایا کرتے تھے۔ بنے بھائی مسکرا دیے۔ پھر سنجیدہ ہوکر بولے کہ بھائی بات ہنسنے کی ضرور ہے لیکن اس میں دل آزاری کا پہلو نکلتا ہے اور یہ بری بات ہے۔ اگر حیات اللہ کے والد کا دماغی توازن قائم نہیں رہا تو اس میں بے چارے حیات اللہ کا کیا قصور ہے جو تم لوگ اس کا مذاق اڑاتے ہو۔ بہرحال بنے بھائی اور سردار جعفری، حیات اللہ کو سمجھا بجھا کر کانفرنس میں تو لے آئے

لیکن حیات اللہ کا غصہ فرو نہ ہوا۔ انھوں نے نہ تو کوئی تقریر کی اور نہ بحثوں میں شریک ہوئے بلکہ ہم لوگوں سے مہینوں خفا رہے۔

حیات اللہ انصاری سوشلزم کے حق میں کبھی نہ تھے لیکن سوشلزم کی مخالفت میں جو شدت اور جذباتیت ان میں آئی اس میں ہم لوگوں کی نازیبا حرکتوں کا بھی بڑا دخل ہے۔ وہ علیگڑھ میں مجاز کے ہم سبق تھے اور ہوسٹل میں ان کا کمرہ میرے کمرے سے ملا ہوا تھا۔ اس لیے ہم لوگوں کی دوستی ان سے بہت پرانی تھی۔ لیکن لکھنؤ میں ہم لوگوں نے ان کے ساتھ جو رویّہ اختیار کیا تھا وہ ہرگز مناسب نہیں تھا۔ وہ مجاز کے فقروں کا جواب نہیں دے سکتے تھے اور نہ سیاسی بحثوں میں ہم لوگوں سے جیت سکتے تھے۔ لیکن ہم لوگ اگر احساس برتری کا شکار نہ ہوتے تو حیات اللہ انصاری شاید سوشلزم اور ترقی پسند ادب کی تحریک کی مخالفت میں اتنا مبالغہ نہ کرتے۔

دوسری جنگ عظیم کے شروع ہونے کے کچھ عرصے کے بعد ملک میں داروگیر کا ہنگامہ شروع ہوا تو بنّے بھائی بھی گرفتار کر لیے گئے۔ برطانوی حکومت نے بائیں بازو کے قریب قریب سبھی رہنماؤں کو دیولی کیمپ میں نظر بند کیا تھا۔ یہ جگہ راجپوتانہ کے ریگستان میں واقع تھی اور کیمپ کی نگرانی فوجی افسروں کے سپرد تھی۔ چنانچہ ڈاکٹر زیڈ اے احمد، ڈاکٹر اشرف، محمود الظفر وغیرہ دیولی کیمپ میں نظر بند تھے البتہ سجاد ظہیر کو لکھنؤ سینٹرل جیل میں رکھا گیا تھا۔ میں ان دنوں انگریزی کے روزنامے 'نیشنل ہیرالڈ' میں، جس کے صدر پنڈت جواہر لال نہرو تھے اسسٹنٹ ایڈیٹر تھا۔ ایک روز گھر پر بیٹھا ہوا تھا کہ بارہ تیرہ برس کا ایک لڑکا مجھ سے ملنے آیا۔ اس نے اپنا نام بتایا اور کہنے لگا کہ میں لکھنؤ سینٹرل جیل کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کا بیٹا ہوں اور مجھے سجاد ظہیر صاحب نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ میرے گھر کی دو تین بار تلاشی ہو چکی تھی اس لیے میں نے بڑی احتیاط سے گفتگو شروع کی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ بنّے بھائی نے اگر تمھیں بھیجا ہے تو کوئی پرچہ رقعہ بھی دیا ہوگا۔ لڑکا مسکرایا اور اس نے اپنے جوتے

کے اندر سے ایک چھوٹا سا کاغذ کا ٹکڑا نکالا اور میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے بہت غور سے پڑھا تحریر واقعی بنے بھائی کی تھی۔ بس خیر و عافیت کے چند فقرے اور لکھا تھا بوبو ہر ہفتہ مجھ سے ملنے آتی ہیں ان سے کہنا تو وہ تمہارے لیے بھی اجازت حاصل کرلیں گی۔ پھر لکھا تھا کہ یہاں تمہارے اسکول کے ایک ساتھی سے ملاقات ہوئی وہ تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔ ان کے لیے اگر تم کچھ کتابیں اور ضرورت کی دوسری چیزیں بھجوا سکو تو بہتر ہے۔ میں نے حافظے پر بہت زور ڈالا لیکن بالکل یاد نہ آیا۔ میں نے اس لڑکے سے پوچھا کہ میاں اس خط میں ایک سیاسی قیدی کا ذکر ہے مگر نام نہیں لکھا تم جانتے ہو کہ یہ کون شخص ہے۔ لڑکے نے جواب دیا کہ جی ہاں ان کا نام جنے بہادر سنگھ ہے۔ مجھے بڑا اچنبھا ہوا کہ جس جنے بہادر سنگھ کو میں جانتا تھا وہ تو بڑا منحنی سا کھلنڈرا لڑکا تھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ کہیں یہ وہی جنے بہادر سنگھ تو نہیں جو دہشت پسند ہوگیا تھا اور پیری ڈی کے مقام پر ریل گاڑی پر چھاپہ مارنے کے جرم میں سزا کاٹ رہا تھا۔ میں نے اس لڑکے سے پوچھا تو اس نے کہا کہ جی ہاں یہ وہی جنے بہادر سنگھ ہے مگر اب وہ Terrorist نہیں رہا بلکہ جیل ہی میں کتابیں پڑھ پڑھ کر کمیونسٹ ہوگیا ہے۔ میں نے کچھ کتابیں اور ضرورت کی کچھ چیزیں جو عجلت میں فراہم ہوسکتی تھیں اکٹھا کیں اور اس لڑکے کے حوالے کردیں۔ میں نے اس سے کئی بار ملنے کی بھی کوشش کی مگر اجازت نہیں ملی۔ ملک جب آزاد ہوا تو دوسرے دہشت پسندوں کی طرح جنے بہادر سنگھ بھی دس بارہ سال قید کاٹنے کے بعد رہا ہوگیا اور اس کا شمار اعظم گڑھ کے سب سے مقبول اور محنتی لیڈروں میں ہونے لگا۔ وہ کمیونسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر صوبائی اسمبلی کا رکن بھی منتخب ہوا تھا مگر افسوس ہے کہ میں اس کی رہائی کے بعد بھی جنے بہادر سنگھ سے کبھی نہ مل سکا اس لیے کہ میں ملک سے باہر تھا۔ سنتا ہوں کہ جنے بہادر سنگھ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔

دوسرے ہفتے میں بنے بھائی سے ملنے جیل گیا اور بوبو کے ساتھ ہونے کی وجہ سے بہت دیر تک اُن سے باتیں کرتا رہا۔ بوبو صوبائی اسمبلی کی ممبر تھیں اور وزیروں اور سرکاری

حلقوں میں لوگ ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ کوئی شخص ان کی بات ٹالنے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔ حتیٰ کہ سروزیر حسن بھی ان سے گھبراتے تھے۔

جون ۴۲ء میں جب ہٹلر نے سوویت یونین پر حملہ کیا اور کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے یہ اعلان ہوا کہ سامراجی جنگ اب عوامی جنگ میں بدل گئی ہے تو تمام کمیونسٹ قید سے رہا کردیے گئے اور کمیونسٹ پارٹی پر سے پابندیاں اٹھالی گئیں۔ یاد رہے کہ کانگریسی لیڈر اور کارکن اس سے بہت پیشتر رہا ہو چکے تھے۔ رہائی کے بعد بنّے بھائی بمبئی چلے گئے۔ وہ کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے رکن تھے اور پارٹی کے ادبی اور تہذیبی محاذ کے نگراں۔ اس کے علاوہ کمیونسٹ پارٹی کے ہفت روزہ اخبار 'قومی جنگ' کی ادارت بھی انھیں کے سپرد تھی۔ 'قومی جنگ' کی اشاعت کو ابھی شاید دو تین مہینے ہوئے ہوں گے ایک دن بنّے بھائی کا خط آیا کہ تم 'نیشنل ہیرالڈ' کی ملازمت سے استعفیٰ دو اور یہاں آ کر ہمارے ساتھ کام کرو۔ ساتھ ہی یہ بھی لکھا تھا کہ مجھے تمہاری تن آسانیوں کا علم ہے لہٰذا اطلاعاً تحریر ہے کہ تمہیں ۳۰ روپیہ ماہوار بحیثیت ایک کل وقتی کارکن کے ملیں گے۔ اس میں سے ۱۷ روپے کھانے کے کٹ جائیں گے۔ کھانا پارٹی ہیڈ کوارٹر میں سب کے ساتھ چٹائی پر بیٹھ کر کھانا ہوگا۔ جھوٹے برتن خود دھونے ہوں گے۔ کھانے کا مینو یہ ہوگا۔ دال، گجراتی وضع کی جس پر کھ...ے ں ہوائی تیرتی ہوگی۔ باجرے کی روٹیاں اور ایک گلاس پانی ہفتے میں ایک وقت شام کو گجراتی وضع کی کری (گوشت کا سالن) صبح کے وقت اور پھر تین بجے ایک گلاس چائے اور ڈبل روٹی کا ایک ٹکڑا۔ رہنے کے لیے پارٹی کا اقامت خانہ جس میں سونے کے لیے چٹائی، پانچ روپیہ مہینہ پارٹی کی اُجرت سے کرایہ کٹ جائے گا۔ گویا تمہیں کٹ کٹا کر کل آٹھ روپے بچیں گے۔ اس میں کپڑے دھلواؤ یا خود دھوؤ، سگریٹ پیئو یا نہ پیئو، ٹرام یا بس پر چلو یا پیدل، تمہاری مرضی ہے۔ امید ہے کہ تم ان خوشگوار شرطوں کو قبول کرو گے اور آنے کی تاریخ سے مجھے اطلاع دو گے۔ بنّے بھائی نے جس اعتماد سے مجھے خط لکھا تھا اس کا ایک ہی جواب

ہوسکتا تھا چنانچہ میں بمبئی پہنچ گیا۔

تبھی مانکی کے تین سال جو میں نے بمبئی میں گزارے، جتنی روحانی مسرت اور ذہنی سکون مجھے ان تین برسوں میں ملا وہ پھر کبھی نصیب نہ ہوا۔ کسی قسم کی کوئی فکر نہ تھی۔ اپنی مرضی سے کام کرتے تھے۔ جی چاہا تو دن دن بھر، رات رات بھر، نہیں جی چاہا تو نہیں کیا۔ اور پھر یہ اطمینان کہ اتنی بڑی پارٹی ہماری پشت پناہ ہے، کبھی نصیب نہیں ہوا۔

اسٹیشن پر وہ خود مجھے لینے آئے اور پھر راستے میں کہنے لگے کہ یوپی کے سید زادوں کے لیے اپنی پرانی عادتوں کو یک لخت ترک کرنا مشکل ہوتا ہے اس لیے فیصلہ ہوا ہے کہ تم کچھ روز میرے ساتھ رہو۔

بنے بھائی ،ال کشمیر روڈ پر جو ملا بار ہل سے ملحق علاقہ ہے ایک پرانی عمارت کی نچلی منزل میں رہتے تھے۔ فلیٹ میں دو کمرے تھے اور ایک باورچی خانہ۔ بڑے کمرے میں ایک تخت تھا، دو تین پرانی کرسیاں پڑی تھیں اور ایک دری بچھی ہوئی تھی۔ یہ کمرہ سڑک پر کھلتا تھا اور نسبتاً ہوادار تھا۔ دوسرا کمرہ اندر کی جانب تھا اور دن کو بھی اندھیرا گھپ رہتا تھا۔ وہاں نہ ہوا کا گزر تھا نہ روشنی کا۔ بنے بھائی رضیہ آپا اور ان کی دو چھوٹی چھوٹی بچیاں اسی کمرے میں سوتی تھیں۔ میں تقریباً چار یا چھ ہفتے وہاں رہا اور یہ میرا پہلا اتفاق تھا ان کے ساتھ رہنے کا۔

بنے بھائی کے فلٹ کی ایک سمت میں تھوڑی سی کھلی جگہ تھی اور اس کے بعد تین چار کوٹھریاں تھیں۔ ان کوٹھریوں میں ہماری طرف گوالے رہتے تھے۔ جن کو بمبئی میں بھیا کہتے تھے۔ چنانچہ آفس میں ہم لوگ بھی بھیا لوگ کہلاتے تھے۔ یہ لوگ شام کے وقت کام کاج سے فارغ ہوکر کھلی جگہ میں اپنا ناریل کا حقہ لے کر بیٹھ جاتے اور دیر تک پر کبھی برہا اور بھجن گاتے اور کبھی رامائن کی چوپائیاں لہک لہک کر پڑھتے۔ اس وقت بنے بھائی کی حوتی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ سب کام کاج چھوڑ کر کھڑکی کے پاس کھڑے ہوجاتے اور گوالوں کے

گانے سنتے رہتے تھے۔ رضیہ آپا کبھی کبھی بنّے بھائی کے اس شوق سے بیزار ہو جاتیں۔ بنّے بھائی بڑی معصوم مسکراہٹ سے کہتے کہ رضیہ بیگم تم اجمیر کی سیلانی ہو تم کیا جانو کہ ہمارے اودھ کی اس تہذیب میں کتنا جادو، کتنا رس، کتنی مٹھاس ہے۔ یہی محنت کش تو ہیں جو ہمارے سماج کا سارا بار اٹھائے ہوئے ہیں مگر اپنی تمام ناداریوں کے باوجود وہ اپنی تہذیب کو نہیں بھولے ہیں۔ ان کی زندگی میں خوشی کے یہی دو چار لمحے تو ہیں جس سے وہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتے ہیں۔

مجھے بمبئی گئے ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ ایک روز بڑا دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ بس اسٹاپ اور پارٹی آفس کے درمیان سبزیوں اور پھلوں کی ایک منڈی تھی، میں ادھر سے گزرا تو ایک شخص گلاب کے پھول بیچ رہا تھا، شاید دو آنے یا تین آنے درجن کے حساب سے۔ میں نے دو درجن پھول خرید لیے اور پارٹی آفس لے آیا، اتنے میں سردار جعفری بھی آ گئے۔ اور پھولوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ ہم دونوں نے پھولوں کو گلاس میں سجا کر میزوں پر رکھ دیا۔ جس کمرے میں ہم لوگ بیٹھے تھے وہ مشکل سے تین گز چوڑا اور چھ گز لمبا ہوگا۔ اس میں کوئی چار یا پانچ میزیں ایک دوسرے سے ملی ہوئی رکھی رہتی تھیں۔ ایک میز پر بنّے بھائی بیٹھتے تھے، دوسری پر سردار جعفری، تیسری پر منظر رضوی، چوتھی پر ڈاکٹر اشرف اور پانچویں پر میں۔ ڈاکٹر اشرف بڑے عالم فاضل آدمی تھے۔ کچھ عرصے بعد انھوں نے اپنا کمرہ بدل لیا کیونکہ وہ کہتے تھے تم لوگ باتیں بہت کرتے ہو، مجھے کام نہیں کرنے دیتے۔ لیکن بنّے بھائی ہماری اور سردار جعفری کی باتوں سے کبھی تنگ نہ آئے۔ بلکہ وہ کبھی کبھار خود ہماری باتوں میں شامل ہو جاتے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد جب بنّے بھائی آئے تو نہ صرف کمرہ بلکہ کمرے کے سامنے کا گلیارہ بھی پھولوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ گلدستے دیکھ کر وہ حیران ہو گئے۔ کہنے لگے یہ پھول کہاں سے آئے بھئی، یہ تو بہت خوبصورت ہیں۔ ہم نے روداد سنائی تو انھوں نے ایک پھول نکال کر اپنی بوشرٹ کے کاج میں لگا لیا اور کام میں

مصروف ہو گئے۔

کام کرتے کرتے ہماری نظر جب بھی دروازے کی طرف اٹھتی تو ہم دیکھتے کہ گلیارے میں رفیقوں کی آمدورفت کچھ زیادہ ہی ہوگئی ہے۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد کوئی نہ کوئی ساتھی اُدھر سے گزرتا ایک لمحے کے لیے ہمارے دروازے کے سامنے رکتا، پھولوں کو غور سے دیکھتا اور گزر جاتا۔ مگر نہ کسی نے ہم سے کوئی سوال کیا نہ ہمیں یہ خیال ہوا کہ پھول سجانا کوئی بری بات ہے۔ سہ پہر کی چائے کے بعد سردار جعفری نے کہا کہ یار گوالیار پاٹری کے بڑے خوبصورت گلدان یہاں ملتے ہیں چلو خرید لائیں۔ چنانچہ ہم لوگ ہارن بی روڈ پہنچ گئے۔ وہاں سے سیاہ رنگ کا مٹی کا ایک روغنی گلدان خریدا اور دفتر میں لاکر پھولوں کو اس میں سجا دیا۔ پھولوں کی رونق اب دوبالا ہوگئی تھی۔

شام کے وقت پارٹی کے جنرل سکریٹری کامریڈ جوشی آئے تو انھوں نے بھی پھولوں کی بڑی تعریف کی۔ ان کا طریقہ تھا کہ ہفتے میں ایک آدھ بار ہمارے کمرے میں آتے، میز پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ جاتے اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگتے۔ چلتے وقت انھوں نے کہا کہ یار یہ پھول اچھے ہیں ہمیں دے دو۔ تم لوگ دوسرے خرید لینا۔ ہم لوگوں نے پھولوں کے گلدان ان کے حوالے کردیے اور وہ گلدان ہاتھ میں اٹھائے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ تین چار روز کے بعد ایک دن وہ صبح سویرے آئے اور کہنے لگے کہ بھائی وہ پھول تو سوکھ گئے، ہمیں دوسرے پھول لادو لہٰذا ہم لوگ گئے اور منڈی سے تھوڑے سے گلاب کے پھول خرید کر لائے اور جوشی کے کمرے میں رکھ دیے۔ کوئی گیارہ بجے کا وقت تھا کہ جوشی صاحب گلدان لائے اور میری میز پر رکھ دیا۔ میں نے حیرت سے پوچھا کیوں کیا آپ کو پھول پسند نہیں آئے۔ کہنے لگے، نہیں یہ بات نہیں ہے، پھول بھی اچھے ہیں گلدان بھی بہت خوبصورت ہے۔ لے کر ایک طرف رکھ دیا تو کہنے لگے کہ تم لوگوں کی سمجھ میں آیا کہ پھول میں تمہارے یہاں سے کیوں اٹھا لے گیا تھا؟ ہم نے کہا نہیں۔ ہم سمجھے تھے کہ پھول آپ کو اچھے لگے،

آپ لے گئے۔ بولے بات یہ نہیں تھی اصل قصہ یوں تھا کہ تم نے پھول لاکر یہاں سجائے تو پورے پارٹی آفس میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ دیکھو ایک اور پیٹی بوژوا یہاں آدھمکا ہے۔ ہمارے عام کامریڈ یہ سوچ ہی نہیں سکتے کہ کوئی انقلابی کارکن پھولوں سے محبت کرنے کا بھی وقت نکال سکتا ہے۔ ان کے خیال میں پھولوں سے محبت کرنا سرمایہ دارانہ، جاگیردارانہ ذہنیت ہے۔ اسی غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے میں نے تمہارے پھول دو تین روز تک سامنے اپنی میز پر رکھے تاکہ سب ساتھیوں کو معلوم ہوجائے کہ پھول سجانا کوئی انقلاب دشمن حرکت نہیں ہے۔

دراصل گجرات کے قوم پرست عناصر پر گاندھی جی کی چھاپ اتنی گہری تھی کہ وہ آرائش اور زیبائش کے معصومانہ اظہار سے بھی گریز کرتے تھے۔ حالانکہ جنوبی ہندوستان میں پھولوں کا رواج شمالی ہندوستان سے کہیں زیادہ تھا۔ کیا بچے کیا جوان سب کو پھولوں کا شوق تھا۔ چنانچہ میں روز دیکھتا تھا کہ سات سات آٹھ آٹھ سال کی لڑکیاں ننگے پاؤں لہنگا پہنے ہوئے بستہ بغل میں دبائے ہوئے اسکول جاتی تھیں لیکن پھولوں کا گجرا ہر بچی کے جوڑے یا چوٹی میں لگا ہوتا تھا۔ دکن کے گجروں کی بناوٹ ہمارے گجروں سے مختلف ہوتی ہے۔ یہ گجرے چمبیلی یا موتیے کی کلیوں کو سوت کے موٹے تاگے میں پھندے دے کر کس دیا جاتا تھا اس طرح کہ ان کی شکل چوہے دانی کی سی ہوجاتی تھی۔

ان دنوں بمبئی میں ترقی پسند ادب کے سب ہی ستارے سمٹ آئے تھے۔ کرشن چندر، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، خواجہ احمد عباس، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، مہندر ناتھ اور قدوس صہبائی۔ گجراتی اور مرہٹی کے ترقی پسند ادیبوں کا بھی سب سے بڑا مرکز بمبئی ہی تھا۔ اردو ادیبوں کے جلسے عام طور پر بنے بھائی کے فلیٹ میں ہوتے تھے۔ البتہ کبھی کبھار احمد عباس اور کرشن چندر کے وہاں بھی بیٹھکیں ہوجاتی تھیں۔ یہ بیٹھکیں بڑی غیر رسمی ہوتی تھیں نہ کوئی صدر چنا جاتا تھا، نہ رپورٹ پیش ہوتی تھی، اگر کوئی نظم، کہانی، ڈرامہ یا مضمون لکھ کر لاتا

اور پڑھ کر سناتا تو اس پر بحث ہوجاتی ورنہ کسی ادبی موضوع پر تبادلہ خیال کر لیتے تھے۔ شکر راشن میں ملتی تھی پھر بھی رضیہ آپا بے چاری ہم سب کو ایک ایک پیالی چائے ضرور پلا دیتی تھیں۔ میرے امریکہ چلے جانے کے بعد جب حمید اختر، ساحر لدھیانوی، حاجرہ مسرور، خدیجہ مستور اور نئی نسل کے کچھ اور ادیب بمبئی پہنچے تو ان جلسوں کی باقاعدہ روداد یں مرتب ہوکر قدوس صہبائی صاحب کے ہفت روزہ 'نظام' میں شائع ہونے لگیں۔

تقسیم کے بعد مئی ۴۸ء میں میں بمبئی واپس آیا تو دنیا ہی بدلی ہوئی تھی۔ پارٹی کے قریب قریب سب ہی رہنما جیل میں تھے یا روپوش۔ تلنگانہ میں کسانوں کی مسلح جدوجہد جاری تھی۔ میں نے سردار جعفری کے ذریعے پارٹی کے رہنماؤں کو اپنے پہنچنے کی اطلاع دے دی تو کئی ہفتے کے بعد مجھے ڈاکٹر ادھیکاری سے ملاقات کا موقع ملا۔ ملوانے والے حسن ناصر تھے جن سے میں بالکل واقف نہ تھا۔ ڈاکٹر ادھیکاری نے دوسری پارٹی کانگریس کی پوری روداد مجھے سنائی اور بتایا کہ پاکستان میں ایک الگ کانگریس پارٹی بن گئی ہے۔ سجاد ظہیر اس کے جنرل سیکریٹری چنے گئے ہیں۔ وہ کراچی پہنچ چکے ہیں۔ اور تمہیں بھی وہیں جانا پڑے گا۔ میں جولائی ۴۸ء میں بمبئی سے کراچی آیا۔ حسن ناصر سے دوبارہ ملاقات ہوئی۔ حسن ناصر کی عمر اس وقت میرا خیال ہے انیس بیس برس سے زیادہ نہ ہوگی۔ لیکن وہ بڑی جانفشانی اور خلوص سے پورا وقت پارٹی کے کاموں میں صرف کر رہا تھا۔ حسن ناصر نے بتایا کہ بنے بھائی لاہور میں ہیں اور آپ کے منتظر ہیں۔ بنے بھائی لاہور میں اپنے پرانے دوست اور آکسفورڈ یونیورسٹی کے ساتھی کی کوٹھی کے بالائی حصے میں مقیم تھے۔ انھوں نے مجھے بھی اپنے پاس ہی ٹھہرا لیا۔ ان کے ساتھ میں رہنے کا دوسرا موقع تھا لیکن حالات بالکل مختلف تھے۔ دو کمروں کا یہ فلیٹ ہماری قیام گاہ بھی تھا اور پارٹی کا ہیڈ آفس بھی۔ بنے بھائی کہیں آتے جاتے تھے اور نہ مجھے گھر سے باہر نکلنے کی اجازت تھی حالانکہ لاہور شہر میں مجھے پہچاننے والے گنتی کے دو چار آدمی ہوں گے۔ بمبئی کی طرح ان کے معمولات میں یہاں بھی کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ صبح

اٹھنا، باقاعدگی سے شیو کرنا، نہانا اور کپڑے بدل کر اس طرح ناشتہ کرنا گویا دفتر جا رہے ہیں۔ ناشتے سے فارغ ہو کر پارٹی کی رپورٹیں لکھنا۔ خطوں کے جواب دینا یا مضمون لکھنا، ایک ڈیڑھ بجے کے قریب کھانا کھانا اور پھر تھوڑی دیر آرام کرنا، قیلولے سے فارغ ہو کر سہ پہر کی چائے پینا، تھوڑی دیر پڑھنا یا اگر لکھنے کا کام باقی رہ گیا ہے تو لکھنا۔ جھٹپٹا ہوتے ہی چھت پر نکل کر تھوڑی دیر ٹہلنا اور پھر نہا دھو کر کتابیں پڑھنا یا کوئی ملنے والا آ گیا تو اس سے باتیں کرنا۔ نو بجے کے قریب کھانا کھانا اور پھر گیارہ بارہ بجے تک پڑھنا اور پھر سو جانا۔ یہ تھا ان کا روزمرہ کا پروگرام۔ کبھی کبھار وہ مزدوروں کے معتبروں یا پارٹی کے کارکنوں سے ملنے جاتے تو پھر ایک دو دن مجھے ان کی خبر نہ ہوتی۔ نہ وہ مجھے بتاتے کہ میں کہاں جا رہا ہوں اور کب لوٹوں گا اور نہ میں کبھی ان سے پوچھتا۔ البتہ واپسی پر وہ اپنے تاثرات ضرور بیان کرتے، بھئی فلاں کارکن بہت تیز ہے بہت اچھا کام کر رہا ہے۔ فلاں صاحب فقط باتوں کے طوطا مینا اُڑاتے ہیں، کام دھیلے کا نہیں کرتے۔ فلاں نے مجھے یہ رپورٹ دی ہے اسے پارٹی اخبار میں ضرور چھاپنا۔ ایک روز مجھ سے پوچھنے لگے کہ تم نے لینن کی کون کون سی کتابیں پڑھی ہیں۔ میں نے بتا دیا تو کہنے لگے پڑھے ہوئے کتنے دن ہو گئے۔ میں نے کہا کہ کوئی پانچ چھ سال۔ بولے پانچ چھ سال کی پڑھی ہوئی چیزیں اب بھلا کیا یاد ہوں گی۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ کہنے لگے کہ پارٹی کی تنظیم کے لیے لینن کا بغور مطالعہ بہت ضروری ہے۔ تم نے جس وقت یہ کتابیں پڑھی تھیں تو ظاہر ہے کہ تنظیمی تقاضوں کو سامنے رکھ کر ان پر غور نہیں کیا ہوگا بلکہ شوقیہ پڑھا ہوگا۔ لہٰذا اب لینن کو دوبارہ پڑھو اور پاکستان کے معاشی، سماجی اور سیاسی حالات کو نظر کے سامنے رکھ کر تا کہ لینن کی تعلیمات کی روشنی میں اپنا لائحہ عمل اور طریقہ کار مرتب کر سکو۔

مگر یہ مشورہ جتنا آسان تھا اس پر عمل کرنا اتنا ہی مشکل ثابت ہوا۔ بنے بھائی اور میں نے لینن کی کتابوں کا بغور مطالعہ کیا لیکن ان کے جو نتائج اخذ کیے وہ لینن کی تعلیمات کا عین

ضد تھے۔ ہم نے اپنی خواہشوں پر حقیقت کا گمان کیا اور لینن کی بار بار تنبیہ کے باوجود بائیں بازو کی انتہا پسندی کا شکار ہوئے۔ نہ صرف شکار ہوئے بلکہ لینن کی کتابوں سے اس انتہا پسندی کا جواز بھی ڈھونڈ نکالا۔

انسانی مسائل کا غیر جذباتی اور سائنسی مطالعہ بہت مشکل ہوتا ہے۔ انسان پانی کا قطرہ یا دھات کا ٹکڑا نہیں ہے کہ اس کے مطالعے میں ذاتی خواہشات اور عقائد اور تعصبات کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ تجربہ کرنے والا مسلمان ہو یا عیسائی، کافر ہو دہریا، پانی کے قطروں کا جب بھی تجزیہ کرے گا اس میں دو حصے ہائیڈروجن اور ایک حصہ آکسیجن ہی کا نکلے گا۔ کوئی سائنسدان اس میں سے تیسری گیس برآمد نہیں کرسکتا۔ لیکن انسانی رشتے اور انسان کی بنائی ہوئی دنیا کے تانے بانے اتنے پیچیدہ ہوتے ہیں اور خود ان کا مطالعہ کرنے والے کی ذات ان رشتوں سے اس طرح منسلک ہوتی ہے کہ اس کے لیے تجربہ گاہ میں کام کرنے والے سائنسداں کا طرزِ فکر وعمل اختیار کرنا قریب قریب ناممکن ہوجاتا ہے۔

سجاد ظہیر کی ذات کو بھی یہ دشواریاں پیش آئیں انھوں نے مارکسزم کا باقاعدہ مطالعہ کیا تھا۔ وہ مارکسی نظریات کو برتنے کی کوشش بھی کرتے تھے۔ ان کو طبقاتی جدوجہد، سماجی انقلاب اور کمیونزم کی فتح پر پورا پورا یقین بھی تھا۔ ان کی وفاداری اور اصول پرستی بھی شبہ سے بالاتر تھی لیکن اس کے باوجود وہ اس منصب کے اہل نہ تھے جو اُن کو سونپا گیا تھا اور ان کو اپنی اس خامی کا پورا پورا احساس بھی تھا۔ انھوں نے کئی بار اس کا اعتراف بھی کیا کہ یہ بار گراں میرے بس کی بات نہیں ہے لیکن مشکل یہ تھی کہ پاکستان میں دوسرے کسی انقلابی میں وہ صلاحیتیں بھی نہ تھیں جو بنے بھائی میں تھیں۔ تقسیم کے وقت صوبہ سرحد اور سندھ میں تو کمیونسٹ پارٹی کا کام برائے نام ہی تھا لیکن پنجاب کی پارٹی بڑی باقاعدگی سے کام کررہی تھی البتہ صوبائی پارٹی کے اکثر و بیشتر رہنما سکھ تھے۔ ان میں کوئی غدر پارٹی سے وابستہ رہ چکا تھا اور کسی نے دس دس، بارہ بارہ سال جیلوں کی سختیاں برداشت کی تھیں۔ چنانچہ پنجاب

کے مزدوروں اور کسانوں پر ان کا بڑا اثر تھا۔ مسلمان ساتھیوں کو تو جو نوجوان شامل ہوئے تھے پارٹی کی طرف سے مسلم لیگ میں شامل ہونے کی اجازت دے دی گئی تھی کیونکہ ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی نے پاکستان تحریک کی بھرپور حمایت شروع کردی تھی اور پارٹی کا خیال تھا کہ یہ مسلمان نوجوان مسلم لیگ میں شریک ہو کر مسلم عوام کے انقلابی شعور کو تیز کریں گے اور مسلم لیگ کی سیاست پر جو جاگیرداروں کے زیر اثر تھی خوشگوار اثر ڈالیں گے۔ باقی ماندہ مسلمانوں میں فقط تین چار پرانے اور تجربہ کار مسلمان رہنما باقی رہ گئے تھے۔ سرحد میں محمد حسین عطا، سندھ میں جمال الدین بخاری اور پنجاب میں دادا فیروز الدین منصور اور مرزا محمد ابراہیم جو اس علاقے کے سب سے مقبول مزدور رہنما تھے۔ ریلوے کے مزدوروں پر ان کا خاص اثر تھا۔ سکھ اور ہندو کمیونسٹوں کے چلے جانے کے بعد کمیونسٹ پارٹی میں بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا۔ اس خلا کو پر کرنا بہت مشکل کام تھا اور اس کے لیے کسی نہایت تجربہ کار اور مستحق انقلابی رہنما کی ضرورت تھی جو کم از کم مغربی پاکستان کے معاشی اور سماجی حالات سے واقف ہوتا۔ اس نے یہاں پر کام کیا ہوتا اور اس کی جڑیں یہاں کی زمین میں پیوست ہوتیں۔ بدقسمتی سے سجاد بھائی میں یہ اوصاف موجود نہیں تھے۔ ان کی تربیت ہی بالکل دوسرے ماحول میں ہوئی تھی۔ پارٹی کی سیاسی تنظیم کا انھیں بالکل تجربہ نہ تھا۔ ان کی طبیعت کا میلان ادب اور ثقافت کی طرف تھا۔ انھوں نے نہ تو کبھی جسمانی محنت کی تھی اور نہ وہ محنت کشوں کی طرح جب آئے عوام میں گھل مل کر رہنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اس پر [illegible] تھا۔ حتیٰ کہ ان کو روپوش ہو کر کام کرنا پڑا۔ اس کی وجہ سے وہ یہاں کے لوگوں سے واقف بھی نہ ہو سکے۔ اگر وہ پارٹی ہیڈ کوارٹر میں رہتے تو انھیں زندگی کا براہ راست تجربہ ہوتا۔ مختلف نوعیت، مختلف پیشوں اور جماعتوں کے لوگوں سے ملتے جلتے، بات چیت کرنے سے ملک کے حالات کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن روپوشی کی وجہ سے ان کا رشتہ سب سے کٹ گیا۔ وہ جن لوگوں سے ملتے تھے وہ چنیدہ چنیدہ کارکن لیڈر ساتھیوں کے ذریعے سے

ملتیں جو کبھی کبھار ان سے ملنے آتے تھے۔

لاہور میں بنّے بھائی کے دو بہت پرانے دوست تھے۔ ایک میاں افتخار الدین جو آکسفورڈ یونیورسٹی میں ان کے ساتھ رہ چکے تھے اور دوسرے نواب زادہ امتیاز علی خاں جو نوابزادہ لیاقت علی خان کے سالے، چچا زاد بھائی اور کرنال کے رئیس زادے تھے۔ بنّے بھائی کبھی کبھار منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے ان لوگوں سے ملنے چلے جایا کرتے تھے یا پھر ان کو اپنے پاس بلواتے تھے۔

میاں افتخار الدین بنّے بھائی کو بے حد چاہتے تھے اور کوئی سیاسی قدم ان کے مشورے کے بغیر نہیں اٹھاتے تھے۔ چنانچہ کانگریس سے استعفیٰ دلوانے اور مسلم لیگ میں شامل ہونے پر آمادہ کرنے میں بنّے بھائی کا بڑا ہاتھ ہے۔ مجھے وہ دن یاد ہیں جب میاں صاحب مرحوم ۴۵ء کے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے تاریخی اجلاس میں شرکت کے لیے بمبئی آئے تھے اور بنّے بھائی کے ساتھ ٹھہرے تھے۔ میاں صاحب تین سال کی قید کے بعد انہی دنوں جیل سے رہا ہوئے تھے وہ پنجاب کانگریس کے صدر تھے اور پنڈت جواہر لال نہرو سے ان کی اتنی گہری دوستی تھی کہ پنڈت جی جب بھی لاہور آتے میاں صاحب ہی کے ساتھ قیام کرتے تھے۔ کمیونسٹ پارٹی چونکہ تحریک پاکستان کی حمایت کررہی تھی اس لیے میاں صاحب کو بھی یہ مشورہ دیا گیا کہ وہ کانگریس سے استعفیٰ دے کر مسلم لیگ میں شریک ہوجائیں۔ میاں صاحب پر کوئی شخص دباؤ نہیں ڈال سکتا تھا اور نہ وہ کسی کی دھمکی سننے کے عادی تھے۔ وہ اپنی مرضی سے اور سوچ سمجھ کر کانگریس میں شریک ہوئے تھے۔ دس بارہ سال کے اندر وہ کئی بار اپنے مسلک کی خاطر جیل جاچکے تھے اور مالی نقصان بھی برداشت کرچکے تھے۔ انھیں اقتدار کی کرسی بھی درکار نہ تھی۔ ان کے تمام دوست احباب نیشنلسٹ خیالات کے تھے۔ مولانا آزاد اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو، کے ساتھ ان کا دن رات کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ ان کے لیے ان تمام تعلقات کو قطع کر کے مسلم لیگ میں شامل ہونا ذہنی اور نفسیاتی طور سے ایک نہایت کرب

ناک فیصلہ تھا۔ یہ فیصلہ آسان نہ تھا۔ وہ یہ تو مانتے تھے کہ مجموعی طور پر مسلم عوام کانگریس کے ساتھ نہیں ہیں اور پاکستان کی تحریک عام مسلمانوں میں بہت تیزی سے مقبول ہو رہی ہے۔ مگر ان کا کہنا تھا کہ قائد اعظم اور سردار عبدالرب نشتر اور گنتی کے دو چار دوسرے محبان وطن کے علاوہ تحریک پاکستان کی قیادت انگریز پرست نوجوانوں اور جاگیرداروں کے ہاتھ میں ہے۔ بھلا میں ان کے ساتھ کس طرح نباہ سکوں گا۔ میاں افتخار الدین کو قائل کرنے کا فریضہ بنے بھائی کے سپرد ہوا۔ وہ میاں صاحب سے دن دن بھر اور رات رات بھر بحثیں کرتے اور انھیں حق خودارادیت کے مضمرات سمجھانے کی کوشش کرتے تھے۔ میاں صاحب کبھی خفا ہوتے کبھی چیختے اور کبھی سگریٹ منہ میں لگا کر کمرے میں ٹہلنے لگتے اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ کوئی زخمی شیر ہے جو پنجرے میں بند کر دیا گیا ہے۔ بنے بھائی دلیلیں دیتے، سمجھاتے اور جب دلیلوں سے کام نہ چلتا تو اپنی پرانی دوستی کے بل پر میاں صاحب کو ڈانٹنے لگتے۔ 'افتی تم دراصل ذہنی طور سے انارکسٹ ہو تم کسی ڈسپلن میں کام کبھی نہیں کر سکتے تمھیں تو بس ہنگامہ چاہیے۔ جلسے جلوس، شور و غل اور ان میں تم سب سے آگے آگے۔ اس سے تمھاری جاگیردارانہ انا کو بھی بڑی تسکین پہنچتی ہے۔ تمھیں یہ بھی فکر ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو گاندھی جی اور مولانا آزاد جیسی بین الاقوامی شخصیتوں سے تمھاری دوستی ختم ہو جائے گی۔'

میاں افتخار الدین پاکستان بننے کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد مسلم لیگی ارباب اختیار کی نظروں میں کھٹکنے لگے اس لیے کہ وہ مسلم لیگیوں کی لوٹ مار میں شریک نہ ہوئے بلکہ جمہوریت، شہری آزادی اور عوام کی فلاح و بہبود کے جن اصولوں کے لیے انھوں نے اب تک قربانیاں دی تھیں وہ اصول یہاں ایک ایک کر کے پامال کیے جا رہے تھے۔ چنانچہ قومی اسمبلی میں اور قومی اسمبلی کے باہر وہ ارباب اختیار کی عوام دشمنی کی پول کھولتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں بالآخر مسلم لیگ سے نکال باہر کیا گیا۔ ۱۹۵۰ء کے وسط میں ایک روز وہ دوپہر کے وقت بنے بھائی سے ملنے آئے۔ میاں صاحب نے اس وقت تک آزاد پاکستان پارٹی

نہیں بنائی تھی۔ وہ کچھ زیادہ ہی جوش میں تھے۔ کہنے لگے کہ' آج صبح سہروردی صاحب آئے تھے اور کہتے تھے کہ آؤ ہم تم مل کر ایک نئی پارٹی بنائیں۔ میں نے حامی بھردی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے۔' بنّے بھائی پر اُن دنوں انتہا پسندی کا غلبہ تھا اور ان پر کیا منحصر ہے ایشیا کی تمام کمیونسٹ پارٹیاں بائیں بازو کی انتہا پسندی کا شکار ہورہی تھیں۔ انڈونیشیا، فلپین، ملایا، برما، ہندوستان ہر جگہ مسلح جدوجہد جاری تھی اور لیڈروں کا خیال تھا کہ اشتراکی انقلاب بس آنے ہی والا ہے۔ حالانکہ انقلاب کے لیے جو خارجی اور داخلی حالات لازمی ہیں وہ بڑی حد تک مفقود تھے۔ خارجی حالات کی پہلی شرط یہ ہوتی ہے کہ آیا ان پیداواری رشتوں میں جو معاشرے میں رائج ہیں اور پیداواری قوتوں میں اتنا تضاد بڑھ چکا ہے کہ اب یہ پیداواری رشتے ٹوٹے بغیر نہ رہیں گے۔ اور کیا عوام ذہنی طور پر کسی انقلابی تبدیلی کے لیے تیار ہیں۔ داخلی حالات سے مراد یہ ہے کہ کیا ملک میں کوئی انقلابی جماعت موجود ہے جو عوام کی انقلابی جدوجہد کی رہنمائی کے فرائض انجام دے رہی ہو۔ اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ اکثر مشرقی ملکوں میں انقلابی حالات موجود ہیں۔ جاگیرداری نظام میں اب پیداوار بڑھانے اور زراعت پیشہ لوگوں کی ضروریات پوری کرنے کی طاقت بالکل نہیں رہی ہے بلکہ یہ نظام اب ملک کی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ جاگیری نظام فقط معاشی رشتوں کا نام نہیں ہے بلکہ ایک طرزِ زندگی اور فلسفۂ حیات بھی ہے۔ جہالت، توہم پرستی، جھاڑ پھونک، دعا، تعویذ، مذہبی تنگ نظری، سائنسی خیالات سے گریز یہ سب چیزیں بھی جاگیری نظام ہی کی پیداوار ہیں۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جاگیری نظام بین الاقوامی سامراج کا سب سے معتبر ستون ہوتا ہے۔ جاگیری نظام ہمارے ملک میں سامراجیوں کا آوردہ اور پروردہ ہے۔ اور آج بھی یہ سامراج ہی کے سہارے زندہ ہے، اور سامراج ہی کے مفاد کی حفاظت کرتا ہے۔ ان پسماندہ ملکوں کا سرمایہ دار طبقہ بھی وطن پرست عنصر نہیں ہے۔ بلکہ وطن دشمن قوت ہے اور سامراج ہی کے بل بوتے پر اپنی دولت کے ایوان تعمیر کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے

کہ ملک کے معاشی حالات بد سے بدتر ہوتے جاتے ہیں، محنت کش طبقوں کی حالت بد سے بدتر ہوتی جاتی ہے اور ان میں بے چینی بڑھتی جاتی ہے۔ لیکن ان انقلابی حالات کے باوجود ملک میں کوئی انقلابی جماعت ایسی نہ تھی اور نہ ہے جو عوام کی جدوجہد کو منظم طریقے پر آگے بڑھا سکے۔

بنے بھائی نے میاں صاحب کی باتیں غور سے سنیں لیکن کتابی مارکسسٹ ہونے کی وجہ سے وہ ملک کے حالات کا صحیح اندازہ نہ لگا سکے۔ انھوں نے کہا کہ "دیکھو اتنی سیاسی پارٹیاں اپنے اپنے طبقوں کی نمائندہ ہوتی ہیں اور انہی کے مفاد کے لیے جدوجہد کرتی ہیں۔ اس وقت بنیادی طور پر ہمارے ملک میں دو سیاسی پارٹیاں موجود ہیں ایک مسلم لیگ جو جاگیرداروں اور سرمایہ دار طبقوں کی نمائندگی کرتی ہے اور دوسری کمیونسٹ پارٹی جو مزدوروں اور کسانوں اور درمیانہ طبقے کے ترقی پسند عناصر کے مفاد کی نمائندگی کرتی ہے۔ اب یہ تم جو [illegible] کے ساتھ [illegible] پارٹی بنانے چلے ہو تو بتاؤ کہ یہ کس طبقے کے مفاد کی نمائندگی کرے گی۔" میاں صاحب کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ بنے بھائی کی باتیں خاموشی سے سنتے رہے اور آخر میں کہنے لگے کہ "اچھی بات ہے شام کو [illegible] آئیں گے تو میں ان سے [illegible] چاہے پوچھ لیں ہو۔" میاں صاحب کی کوٹھی کے [illegible] میں کرسیاں بچھی ہوئی تھیں [illegible] میاں صاحب کے سیاسی حلیف تھے بیٹھے ہوئے تھے۔ [illegible] میاں صاحب [illegible] بہت خوش نظر آتے تھے [illegible] بیٹھے [illegible] [illegible] ہمارے [illegible] [illegible] میاں صاحب [illegible] آخر میں [illegible] [illegible] میاں صاحب [illegible] [illegible] بہت غور [illegible]

رفیقوں سے بھی مشورہ کیا۔ میرا خیال ہے کہ ابھی نئی پارٹی بنانے کا وقت نہیں آیا ہے' یہ سن کر سہروردی صاحب اس طرح اچھلے جیسے انھوں نے بجلی کا تار چھولیا ہو۔ کہنے لگے 'اماں یار صبح تو تم بڑے جوش و خروش سے میری حمایت کررہے تھے اور اب اس وقت تم کنی کاٹ رہے ہو۔ سچ بتاؤ یہ آخر ہوا کیا۔' میاں صاحب نے جواب دیا کہ 'کوئی خاص بات نہیں ہوئی بس میں نے اور میرے ساتھیوں نے یہی فیصلہ کیا ہے کہ ابھی کوئی نئی پارٹی نہ بنائی جائے۔' سہروردی صاحب تھوڑی دیر تو باتیں کرتے رہے مگر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کسی نے ان کے خیالوں کے رنگین محل کو ایک دم سے مسمار کردیا ہو۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے 'اچھا بھائی میں تو سمجھا تھا کہ ہم تم مل کر کچھ کام کریں گے لیکن تمہاری مرضی' میاں صاحب نے انھیں کھانے پر روکنے کی بہت کوشش کی لیکن نہ مانے اور چلے گئے۔ اب سوچتا ہوں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری کج رویوں کا خمیازہ پورے ملک کو بھگتنا پڑا۔

کچھ عرصے کے بعد بنے بھائی کو دورے پر جانا پڑا۔ تقریباً دو مہینے ڈیوس روڈ پر رہنے کے بعد بنے بھائی نے دوسری جگہ منتقل ہونے کا فیصلہ کیا۔ لیکن کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ وہ کہیں ایک جگہ ایک ہفتے بھی جم کر نہ رہ سکے۔ اس بھاگ دوڑ کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بیمار ہوگئے۔ انھیں ٹائیفائیڈ ہوگیا، اس زمانے میں یہاں نہ تو پنسلین ملتی تھی اور نہ Anti Biotics دوائیں۔ پھر روپوشی کی وجہ سے دوا علاج میں بڑی دشواریاں پیش آتی تھیں۔ آخر کار جب ان کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی اور بخار نہ اترا تو ہم لوگوں نے انھیں اسپتال میں داخل کردیا۔ ان کے خلاف گرفتاری کا وارنٹ تھا اس لیے ان کی تیمارداری میں بڑی احتیاط کرنی پڑتی تھی۔ وہ کوئی دو مہینے بیمار رہے، اس بیماری کے عالم میں ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کے بیوی بچے عزیز و اقربا، دوست احباب اس کی مزاج پرسی کرتے رہیں لیکن ان کے بیوی بچے لکھنؤ میں تھے، ان کے نہایت قریبی اعزا جو بڑے بڑے سرکاری عہدوں پر فائز تھے ان سے ملنے پر آمادہ نہ تھے اور حالات کا تقاضا یہ تھا کہ دوست احباب بھی بس کبھی کبھار ان سے

ملیں۔ ان کی بیماری نے غالباً انہیں نفسیاتی اذیتوں کے باعث زیادہ طول کھینچا تھا۔ اس زمانے میں ٹائیفائیڈ بڑا موذی مرض سمجھا جاتا تھا لہذا ڈاکٹر لکھنا پڑھنا تو درکنار ملنے جلنے کی بھی اجازت نہیں دیتے تھے۔ دو ڈھائی مہینے کے بعد بخار ٹوٹا اور بنے بھائی شفایاب ہوکر اسپتال سے لوٹ آئے۔

اس میں کوئی کلام نہیں کہ تنظیمی ناتجربہ کاریوں اور روپوشی کی صعوبتوں کے باوصف بنے بھائی نے جنرل سکریٹری کے فرائض بڑی خوش اسلوبی سے پورے کیے۔ سکھ اور ہندو کامریڈ ہندوستان جاچکے تھے۔ اس کی وجہ سے نظم و ضبط کے سب تانے بانے ٹوٹ گئے تھے۔ بنے بھائی نے یہاں کے بچے کھچے ساتھیوں کی مدد سے یہ تار پھر سے جوڑے، نئے کارکنوں کی تربیت کی اور تین سال کی مختصر مدت میں کمیونسٹ پارٹی کو ایک فعال اور بااثر سیاسی جماعت بنا دیا۔ اب پارٹی دفتر لاہور، گجرانوالہ، لائل پور، راولپنڈی، پشاور، کراچی، سکھر، حیدر آباد، ملتان اور رحیم یار خان میں باقاعدگی سے کام کررہے تھے۔ پارٹی کارکن مزدوروں کی یونینوں، کسان کمیٹیوں، طالب علموں اور ادیبوں کی تنظیموں میں بڑھ چڑھ کر کام کررہے تھے۔ بڑی بات یہ ہے کہ پوری پارٹی میں فکر و عمل کی وحدت پائی جاتی تھی۔ نہ گروہ بندیاں تھیں نہ رقابتیں۔

پارٹی ممبروں کو پارٹی کی قیادت پر پورا بھروسہ تھا اور پارٹی کے رہنما اپنے رفیقوں کو اپنا ساتھی سمجھتے تھے، خیمہ بردار یا رعایا نہیں سمجھتے تھے۔ سب سے حیرت انگیز حقیقت جس کا علم ہمیں گرفتاری کے بعد ہوا یہ تھی کہ اس پارٹی میں خفیہ پولیس کا ایک گماشتہ بھی گھس نہ سکا تھا۔ چنانچہ پولیس کو ہماری انہیں سرگرمیوں کی خبر تھی جو اخباروں میں چھپتی رہتی تھیں۔ پارٹی کی اندرونی تنظیم سے پولیس والے بالکل بے خبر تھے۔ کسی ناتجربہ کار اور نوزائیدہ پارٹی کا یہی کارنامہ کیا کم ہے۔

ہماری کج رویوں کے باوجود کمیونسٹ پارٹی کی مقبولیت ملک میں بڑھتی جارہی تھی۔

مزدوروں کی نمائندہ تنظیم پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن کے بیشتر سرگرم کارکن کمیونسٹ تھے اور اپنی پرخلوص محنت اور خدمت کی بدولت مزدوروں میں ان کا بڑا اثر تھا۔ اسی طرح جگہ جگہ کسان کمیٹیاں بنی ہوئی تھیں۔ سندھ میں حیدر بخش جتوئی مرحوم کی ہاری کمیٹی مصروفِ عمل تھی۔ سرحد میں کسان جرگہ کی رہنمائی میں ہشت نگر کے کسانوں کی تحریک جاری تھی۔ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے طالب علم رہنما اپنے جمہوری حقوق کے لیے پیش پیش تھے۔ قریب قریب ہر بڑے شہر میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخیں قائم تھیں اور ان کے جلسے بڑی باقاعدگی سے ہوتے تھے۔

اسی اثنا میں پنجاب میں صوبائی اسمبلی کے انتخابات کا اعلان ہوا۔ پاکستان میں یہ پہلا انتخاب تھا جو بالغ آبادی کے حقِ رائے دہی کے اصولوں پر لڑا جا رہا تھا۔ پنجاب، پاکستانی سیاست کا مرکزِ ثقل تھا اور اب بھی ہے۔ لیکن وہاں مسلم لیگ کے اندر پاکستان قائم ہونے کے بعد ہی سے اقتدار کی جنگ شروع ہوگئی تھی۔ ایک طرف نواب ممدوٹ اور ان کا گروہ تھا اور دوسری طرف میاں ممتاز دولتانہ کا تھا۔ نظریاتی طور پر دونوں گروہ جاگیرداری نظام کے نمائندہ تھے اور اُسی کے مفاد کے لیے کوشاں لیکن گروہ بندیاں تو طبقاتی یگانگت کے باوجود موجود رہتی ہیں۔ اقتدار کی یہ جنگ کھلے میدان میں نہیں لڑی جاتی تھی بلکہ صوبائی اسمبلی کے اندر، مسلم لیگ کے دفتروں میں یا پھر نواب صاحبان کے محلوں میں۔ البتہ بعض اوقات فریقین کے تنخواہ یافتہ غنڈے میکلوڈ روڈ پر جہاں مسلم لیگ کا دفتر تھا ایک دوسرے کو پچھاڑنے نکل آتے تھے۔ دس پانچ سر پھٹتے تھے، دس پانچ کے ہاتھ پاؤں ٹوٹتے تھے اور پھر گھنٹے دو گھنٹے کے بعد یہ تماشا ختم ہو جاتا تھا۔ پولیس حسبِ معمول واقعہ کے بعد موقع واردات پر پہنچتی تھی۔ ممدوٹ، دولتانہ کی اس چپقلش کا اثر پورے صوبے کی سیاست پر پڑ رہا تھا، وہی مسلم لیگ جس پر اعتراض کرنے والوں کو غدار، ہندوستان کا ایجنٹ اور اسلام کا دشمن کہہ کر بدنام کیا جاتا تھا۔ اب اپنا وقار کھو چکی تھی۔ عام مسلمانوں نے اپنے تجربے سے دیکھ لیا

تھا کہ مسلم لیگی لیڈروں کے دل میں ملک اور قوم کا کوئی درد نہیں ہے۔ انھوں نے تحریک پاکستان میں اپنی غرض اور ہوس کو پورا کرنے کی خاطر شرکت کی تھی۔ اس تحریک میں شامل ہوتے وقت یا اس کے بعد ان میں سے کسی کا ایک بال بھی بیکا نہیں ہوا نہ کسی نے قید خانے کا منہ دیکھا نہ پولیس کے ڈنڈے سے اور نہ انھیں کوئی مالی نقصان پہنچا۔ ان کے لیے پاکستان مال غنیمت سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا تھا، اور سارا جھگڑا اس مال غنیمت کو آپس میں بانٹنے پر تھا۔

نواب ممدوٹ کو پنجاب میں لوگ گونگا پہلوان کہا کرتے تھے۔ وہ نہ تقریر کر سکتے تھے اور نہ تحریر کے اہل تھے۔ ان کے برعکس میاں ممتاز دولتانہ آکسفورڈ یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ تھے، نہایت چالاک، ہوشیار اور چرب زبان سیاست دان تھے۔ دوستوں کے دوست تھے۔ البتہ ان کے لنگوٹیا یار بھی ان پر بھروسہ نہیں کرتے تھے کیونکہ جھوٹے وعدے کرنا اور وعدے کرکے مکر جانا، اپنے ذاتی مقصد کے لیے بڑے بڑے اصول اور عزیز سے عزیز دوست اور ساتھی کو قربان کر دینا ان کا روز کا مشغلہ تھا۔ انھوں نے نواب زادہ لیاقت علی خان کو شیشے میں اتار لیا تھا اور انھی کی ایما سے یہ صوبائی اسمبلی کا الیکشن کرا جا رہا تھا تاکہ ممدوٹ پارٹی کا کانٹا ہمیشہ کے لیے نکال دیا جائے۔

کانگریس پارٹی نے بھی اس صوبائی الیکشن میں شریک ہونے کا فیصلہ کیا۔ ہمیں معلوم تھا کہ ہماری پارٹی اپنی مقبولیت کے باوجود شاید دو یا تین نشستیں حاصل کر سکے لیکن ہم نے دس یا گیارہ حلقوں سے اپنے امیدوار کھڑے کیے۔ مقصد الیکشن جیتنا نہیں تھا بلکہ پارٹی کے اغراض و مقاصد اور پروگرام کو زیادہ سے زیادہ عوام تک پہنچانا تھا۔ اسمبلی کے انتخابات کے موقع پر عام طور پر تحریر و تقریر پر پابندیاں نسبتاً کم ہو جاتی ہیں اور لوگوں تک پہنچنے کے مواقع بہتر ہو جاتے ہیں۔ الیکشن کی سرگرمیاں تیز ہوئیں تو ہمیں یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ عام لوگ ہزاروں کی تعداد میں ہمارے جلسوں میں شریک ہوتے ہیں اور ہماری باتیں ہمدردی سے سنتے

ہیں۔ ملتان اور لائل پور کے دیہی حلقوں سے جو خبریں آئی تھیں وہ بڑی امید افزا تھیں اور لاہور کے مزدور حلقے میں ہمارے امیدوار مرزا محمد ابراہیم کی پذیرائی جس جوش سے ہو رہی تھی اس نے تو ہمارے حوصلے بلند کر دیے تھے۔ پارٹی کے پاس اپنا کوئی سرمایہ نہ تھا اس لیے امیدواروں کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ الیکشن کے مصارف اپنے حلقے کے عوام سے چندے کے ذریعے پورے کریں۔ مرزا ابراہیم ریلوے مزدوروں کے حلقے سے کھڑے ہوئے تھے۔ اس لیے مزدور کارکن سارا کام خود ہی کرتے تھے۔ بلکہ ان کا نعرہ تھا کہ 'ووٹ بھی دو اور نوٹ بھی'۔ پارٹی کی سرگرمیوں کی رپورٹ ظاہر ہے کہ خفیہ پولیس کے ذریعے صوبائی اور مرکزی حکومتوں کو برابر پہنچتی رہتی تھی اور ان حکومتوں کو ہرگز یہ منظور نہ تھا کہ کوئی سیاسی جماعت خواہ وہ کتنی ہی مختصر ہو لوگوں میں مقبول ہو یا ان کے نمائندے کامیاب ہوں۔

اسی زمانے میں کچھ فوجی افسروں نے جنرل اکبر خان کی سربراہی میں حکومت کا تختہ الٹنے کا منصوبہ بنایا۔ یہ لوگ کشمیر کے بارے میں حکومت کے موقف سے مطمئن نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ حکومت انگریز سپہ سالار جنرل گریسی اور اس کے ساتھیوں کے چھانسے میں آ گئی ورنہ ہم سرینگر پر قبضہ کر سکتے تھے۔ جنرل گریسی انہی دنوں ریٹائر ہوئے تھے اور ان کی جگہ جنرل ایوب خان کمانڈر ان چیف مقرر کیے گئے تھے۔ جنرل اکبر خان اور ان کے ساتھی جنرل ایوب خان کو انگریزوں کا ایجنٹ سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ لوگ مسلم لیگ کی خود غرضانہ پالیسیوں سے تنگ آ گئے ہیں اور ان میں اتنی بے چینی پیدا ہو گئی ہے کہ اگر اس وقت حکومت کا تختہ الٹ دیا جائے تو سب لوگ اس اقدام کا خیر مقدم کریں گے۔ بنے بھائی اُن دنوں کراچی گئے ہوئے تھے کہ ایک دن سردار شوکت علی جو صوبائی پارٹی کے سیکریٹری تھے مجھ سے ملنے آئے اور کہنے لگے کہ سیالکوٹ کے چند فوجی افسر سجاد ظہیر سے کچھ سیاسی گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے ان کو جواب دیا کہ بنے بھائی لاہور میں موجود نہیں ہیں وہ جب واپس آ جائیں گے تو میں آپ کا پیغام ان تک پہنچا دوں گا۔ دو تین روز کے بعد وہ پھر آئے اور

انھوں نے اسی قسم کا پیغام راولپنڈی کے کچھ فوجی افسروں کا بھی سنایا۔ آٹھ دس روز کے بعد جب بنّے بھائی کراچی سے واپس آئے تو میں نے انھیں سردار شوکت علی کے پیغامات سے مطلع کردیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ بنّے بھائی ان فوجیوں سے ملے یا نہیں البتہ کوئی دو ہفتے کے بعد انھوں نے پارٹی کی مرکزی کمیٹی کا اجلاس طلب کیا لیکن انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ اجلاس کا ایجنڈا کیا ہوگا۔ مجھ سے انھوں نے صرف یہ کہا کہ تم اپنی رپورٹ تیار کرلو (میں پارٹی کے نشرواشاعت اور ادبی محاذ کا نگراں تھا)۔

مرکزی کمیٹی کا جلسہ کرنے میں بڑی دشواریاں پیش آتی تھیں کیونکہ مرکزی کمیٹی کے قریب قریب آدھے ارکان روپوش تھے اور آدھے اعلانیہ کام کرتے تھے۔ جو اعلانیہ کام کرتے تھے اُن پر سی آئی ڈی کڑی نگرانی رکھتی، اس لیے ان کا روپوش ساتھیوں سے ملنا خطرے سے خالی نہیں ہوتا تھا۔ بہرحال یہ اجلاس ہوا اور بنّے بھائی نے پہلی بار ہمارے سامنے فوجیوں کے منصوبے کا خاکہ پیش کیا۔ ان کی گفتگو سے پتہ چلا کہ وہ اس اثنا میں جنرل اکبر خان اور بیگم اکبر خان سے بھی مل چکے ہیں۔ اس منصوبے پر تقریباً دو دن بحث ہوتی رہی اور دو تین ساتھیوں کے علاوہ سب نے اس کی مخالفت کی۔ یہ مخالفت اصولی بھی تھی اور نظریاتی بھی تھی اور عملی بھی۔ چنانچہ مارکس، لینن اور اینگلس کی تحریروں کے حوالے سے اس خیالی منصوبے کی بڑی مذمت کی گئی۔

ہمارا کہنا تھا کہ سماجی انقلاب مٹھی بھر فوجیوں کی سازش سے نہیں آتا۔ بلکہ اس کے لیے مزدوروں، کسانوں اور درمیانہ طبقے کے ترقی پسند لوگوں کی اکثریت کی عملی حمایت ضروری ہوتی ہے اور اس انقلاب کی قیادت انقلابی جماعت کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ یہ جو مٹھی بھر فوجی افسر ہیں، ہمیں نہ تو ان کے سیاسی رجحانات کا علم ہے اور نہ ہم یہ جانتے ہیں کہ سوشلزم اور کمیونزم سے ان کو کتنا لگاؤ ہے۔ ہمارے وہ ساتھی جو انتہا پسندی کا شکار تھے، وہ بار بار ملایا، برما، تلنگانہ کی مسلح جدوجہد کا ذکر کرتے۔ غالباً غیر شعوری طور پر وہ سمجھتے تھے کہ یہاں

بھی اگر کوئی پھلجھڑی چھوٹی تو یہ چیز خود بہ خود بڑھ کر سماجی انقلاب میں بدل جائے گی۔ دو دن کی مسلسل بحث کے بعد آخر یہ طے پایا کہ فوجیوں سے مزید تفصیلات معلوم کی جائیں۔ اُن کے مقاصد کیا ہیں، وہ ملک میں کس قسم کا معاشرتی نظام قائم کرنا چاہتے ہیں، آیا ان کے ساتھ کچھ غیر فوجی عناصر بھی ہیں یا نہیں اور وہ اپنے منصوبے کو عملی شکل کیسے دیں گے۔ تفصیلات معلوم کرنے کی ذمہ داری سجاد ظہیر کے سپرد ہوئی۔ کوئی دو یا تین ہفتے کے بعد مرکزی کمیٹی کا اجلاس پھر ہوا۔ اور بنّے بھائی نے فوجیوں سے مل کر جو تفصیلات حاصل کی تھیں وہ ہمارے سامنے رکھ دیں۔ ان تفصیلات سے پتہ چلا کہ فوجیوں کا منصوبہ واقعی شیخ چلی کا منصوبہ تھا۔ ان کو نہ تو یہ معلوم تھا کہ وہ کن خطوط پر پاکستانی معیشت اور سیاست کو آگے بڑھائیں گے۔ عوام کے جمہوری حقوق کس طرح فروغ پائیں گے۔ حکومت کا ڈھانچہ کیا ہوگا اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ کمیونسٹ پارٹی سے وہ کیا توقعات رکھتے ہیں۔ اب کے ہم کو فیصلہ کرنے میں دیر نہ لگی چنانچہ یہ طے پایا کہ فوجیوں کے اس منصوبے کو رد کردیا جائے اور ان کو سمجھایا جائے کہ وہ ان طفلانہ حرکتوں سے باز آجائیں۔ چنانچہ یہ طے پایا کہ سجاد ظہیر کے ساتھ میں بھی پنڈی جاؤں اور فوجیوں کو پارٹی کے فیصلے سے مطلع کردیا جائے۔ دوسرے یا تیسرے دن ہم لوگ پنڈی پہنچے لیکن فوجی افسروں کے یکجا ہونے میں تاخیر ہوئی تو میں نے بنّے بھائی سے کہا کہ الیکشن کا زمانہ ہے مجھے فلاں فلاں جگہوں کا دورہ کرنا ہے اس لیے مجھے آپ اجازت دیں۔ چنانچہ میں پنڈی سے لاہور واپس آگیا۔ دو تین دن کے بعد بنّے بھائی لوٹ آئے انھوں نے بتایا کہ فوجی ہماری بات مان گئے ہیں اور انھوں نے فوجی انقلاب کا ارادہ ترک کردیا ہے۔ ہم لوگ الیکشن کی تیاریوں میں مصروف ہوگئے۔

لیکن ہوا یہ کہ اس آخری جلسے کی بھنک جنرل ایوب خان کو اور پھر نوابزادہ لیاقت علی خان کو مل گئی اور حکومت نے اس واقعہ سے صوبائی الیکشن پر پورا پورا فائدہ اٹھانے کا تہیہ کرلیا۔ چنانچہ الیکشن سے تقریباً آٹھ یا دس روز پہلے جنرل اکبر خان، بیگم اکبر خان اور فیض

احمد فیض گرفتار کر لیے گئے اور سرکاری طور پر اعلان ہوا کہ حکومت نے ایک بہت بڑی فوجی سازش کو بروقت ناکام بنا دیا ہے۔ اس کے بعد دوسرے فوجی افسر گرفتار ہونے لگے اور ہم لوگوں کو یقین ہو گیا کہ حکومت پارٹی پر بھی بھرپور وار کرنے والی ہے۔

سازش کی خبروں سے سارے ملک میں سنسنی پھیل گئی اور ہمارے لیے الیکشن میں کام کرنا مشکل ہو گیا۔ ہر طرف خوف اور دہشت کا عالم تھا۔ ہر شخص ڈرا اور سہما ہوا تھا کہ نہ جانے کب پولیس ہمارا دروازہ کھٹکھٹائے۔ پارٹی کے کارکن بھی گرفتار ہونے لگے۔ نہ صرف پارٹی کے کارکن بلکہ وہ ادیب، اخبار نویس بھی جن کا تعلق ترقی پسند ادب کی تحریک سے تھا۔ ۲۱/اپریل ۵۱ء کو میں گرفتار ہوا۔ دوسرے یا تیسرے دن حسن عابدی پکڑے گے جو بنے بھائی کے سکریٹری تھے اور ان کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ محمد افضل، ایرک سپرین، دادا فیروز الدین منصور، حسن ناصر، مرزا ابراہیم۔ غرض یہ کہ شاید ہی کوئی کارکن باہر رہ گیا ہو۔ میں لاہور قلعہ میں نظر بند تھا جب پتہ چلا کہ حسن عابدی بھی وہیں لائے گئے ہیں۔ حسن عابدی کی عمر اس وقت ۲۲، ۲۳ سال سے زیادہ نہ تھی۔ دبلے پتلے نوجوان، بے حد کم گو اور منکسر مزاج۔ لیکن کردار کے غازی اور بڑی سے بڑی اذیت کو ہنس ہنس کر برداشت کرنے والے۔ اُن کی کوٹھری میری کوٹھری کے اوپر تھی اس لیے قلعہ میں اُن پر جو کچھ گزرتی تھی میں اس سے بہ خوبی آگاہ تھا۔ ان پر رات رات بھر مار پڑتی رہتی تھی لیکن وہ منہ سے اُف تک نہ کرتے۔ پولیس ان سے یہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ سجاد ظہیر کس جگہ روپوش ہیں۔ تقریباً آٹھ دن وہ دن رات پٹتے رہے تب ایک پرانے سی آئی ڈی انسپکٹر نے ایک ترکیب چلی۔ یہ شخص بہ ظاہر زبان کا بڑا میٹھا اور بہت شائستہ آدمی تھا۔ بیس پچیس سال سے یعنی تقسیم سے بہت پہلے سے کمیونسٹوں کی سرگرمیوں کی نگرانی پر مامور تھا۔ وہ جانتا تھا کہ انڈر گراؤنڈ تحریک کے اصول اور آداب کیا ہیں اور روپوشی کے عالم میں کمیونسٹوں کا رہنے سہنے اور کام کرنے کا طریقہ کیا ہوتا ہے۔ اس نے حسن عابدی کو کمرے میں بلایا اور بڑے اخلاق سے پیش آیا اور

کہنے لگا کہ آپ تو روپوشی کے اصول سے واقف ہیں پھر آپ خواہ مخواہ کیوں اذیت برداشت کرر ہے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ سجاد ظہیر کو آپ کی گرفتاری کا علم ہو چکا ہوگا اس لیے کہ آپ ان کے ساتھ رہتے تھے اور جب آپ واپس نہیں پہنچے ہوں گے تو وہ سمجھ گئے ہوں گے کہ آپ پکڑ لئے گئے۔ ایسی صورت میں کمیونسٹوں کا طریقہ آپ کو بھی معلوم ہے اور مجھے بھی معلوم ہے۔ وہ یہ کہ فوراً اپنی قیام گاہ بدل دی جائے۔ یہ سو فیصدی سچی بات تھی۔ حسن عابدی کو یقین آ گیا کہ آٹھ دن کی غیر حاضری کے بعد بنّے بھائی یقیناً کسی دوسری جگہ منتقل ہو گئے ہوں گے۔ چنانچہ انھوں نے بنّے بھائی کی قیام گاہ کا پتہ بتادیا۔ اس پولیس افسر نے بعد میں مجھ سے خود کہا کہ 'میں تو صرف رسمی کارروائی پوری کرنے کے لیے اس جگہ گیا تھا۔ مجھے بالکل یقین تھا کہ سجاد ظہیر وہاں سے کہیں اور چلے گئے ہوں گے۔ البتہ وہاں پر کچھ ایسے کاغذات مل جائیں جو ہمارے لیے مفید ہوں یہی وجہ ہے کہ میں مسلح گارڈ بھی اپنے ساتھ نہیں لے گیا تھا بس دو پولیس کانسٹیبل تھے اور ایک میں۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا تو سجاد ظہیر نے دروازہ کھول دیا اور میں ان کو سامنے کھڑا دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔ انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا آیئے، تشریف لایئے، مجھے تو کئی دن سے آپ کا انتظار تھا اور یہ کہہ کر وہ بلا کسی ہچکچاہٹ کے ہمارے ساتھ آ کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔'

بنّے بھائی جب ۵۵ء میں مچھ جیل سے رہا ہو کر لاہور پہنچے اور اپنے پرانے دوست نواب زادہ امتیاز علی خان کے یہاں ٹھہرے تو میں نے بنّے بھائی سے پہلا سوال یہی کیا کہ آپ آٹھ دن تک اس مکان میں ٹھہرے کیوں رہے، کہیں اور کیوں نہیں چلے گئے۔ ہنس کر بولے کہ یار مجھے دوسرے ہی دن یقین ہو گیا تھا کہ عابدی بے چارہ پولیس کے ہتھے چڑھ گیا، لیکن میں نے سوچا کہ حالات اب اتنے نازک ہو چکے ہیں کہ اب کسی دوست یا ہمدرد کے گھر پر پناہ لینا اُس بے چارے کو مصیبت میں ڈالنا ہوگا۔ اس لیے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ دوسروں کو مصیبت میں ڈالنے کے بجائے اسی گھر میں بیٹھا رہوں۔

بنے بھائی کو پولیس قلعہ میں نہیں لائی بلکہ سیدھا حیدر آباد لے گئی۔ یہاں راولپنڈی سازش کیس کے دوسرے ملزمین بھی قید تھے۔ حیدر آباد جیل کے حالات ظفر اللہ پوشنی، فیض احمد فیض اور میجر اسحاق کی تحریروں میں ملتے ہیں۔ لیکن ان کا میرے ذاتی تجربوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ البتہ جب بنے بھائی مچھ جیل سے لاہور آئے تو ریلوے اسٹیشن پر ہم نے ان کا پرجوش خیر مقدم کیا۔ اسٹیشن پر جتنے اُن کے شیدائی تھے اتنے ہی پولیس اور سی آئی ڈی کے نگراں اور جب وہ امتیاز کی کوٹھی پر ٹھہرے تو پولیس نے نہ صرف یہ کہ پوری کوٹھی کا محاصرہ کرلیا بلکہ لارنس روڈ پر بھی ہر طرف پولیس ہی کی موٹریں، موٹر سائکلیں گشت کرتی رہتی تھیں۔

روپوشی کے زمانے میں بنے بھائی کا وزن بہت بڑھ گیا تھا۔ اس لیے کہ نہ ورزش ہوتی تھی نہ کہیں آنا جانا، ایک کمرے میں بیٹھے بیٹھے اُن کا وزن بہت بڑھ گیا تھا۔ البتہ مچھ جیل سے جب وہ لاہور آئے تو وہ مجھے ایسے ہی لگے جیسے بمبئی میں تھے۔ اُن کی صحت بہت اچھی تھی اور وزن بھی تیس چالیس پاؤنڈ کم ہوگیا تھا۔ اُن سے گفتگو کا زیادہ موقع تو نہیں ملا اس لیے کہ ملنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ پھر بھی انھوں نے بتایا کہ میں نے جیل میں دو کتابیں لکھی ہیں ایک ترقی پسند ادب کی تحریک پر اور دوسرے حافظ پر۔ پھر کہنے لگے کہ ترقی پسند ادب کی تحریک پر کتاب کا نام میں نے 'روشنائی' رکھا ہے۔ اس پر ہم نے زور کا قہقہہ لگایا کہ روشنائی، قلم دوات کیا نام ہوا۔ کہنے لگے کہ تم بالکل جاہل ہو، روشنائی کا لفظ حافظ نے علم، آگہی اور روشنی کے معنی میں استعمال کیا۔ ہم نے کہا یہ کتاب حافظ شیرازی تو پڑھنے سے رہے البتہ ہماری زبان میں اس کے معنی وہ نہیں ہیں جو فارسی زبان میں ہیں۔ لہٰذا آپ اس کا نام کچھ اور رکھیں۔ لیکن وہ نہ مانے۔ کہنے لگے کہ ہمارا کام جاہلوں کو علم سکھانا ہے۔ اُن کے جہل کی جڑوں کو مضبوط کرنا نہیں ہے۔ پھر اُٹھ کر کمرے میں گئے اور ایک چھوٹی سی بیاض نکال کر لائے اور بہت شرما لجا کر کہنے لگے کہ یار جیل میں ہم نے شاعری بھی شروع کردی۔

ہم لوگوں نے خوشی اور حیرت کا اظہار کیا۔ کہنے لگے کہ اگر تم لوگ ہنسو نہیں تو کچھ میں اپنے شعر سناؤں۔ ظاہر ہے کہ وہ شعر سنانے کے لیے بہت بے تاب تھے اور اردو کا کون شاعر ایسا ہے جس کے ہاتھ میں بیاض ہو اور وہ شعر سنانے سے گریز کرے۔ شعر، غزل کے تھے اور غزل بھی بڑی روایتی انداز کی۔ وہی گل و بلبل، شمع اور پروانہ، قفس اور صیاد کی صدیوں پرانی علامتیں، نظم کی گئی تھیں۔ تخلیہ ہوا تو بنے بھائی نے کہا یار سچ سچ بتاؤ ان اشعار میں کچھ دم ہے یا نہیں۔ مجھے دفعتاً بنے بھائی کا ایک برہا یاد آ گیا جو انھوں نے لینن کی شان میں لکھا تھا۔ اس کا ایک مصرع ہے۔

روس ملک میں متئی رہا ایک لینن وا کا نام بھیا
لینن وا کا نام

یہ برہا اودھی زبان کی ایک صنف ہے اور ہمارے دیہات میں کسانوں میں بہت مقبول ہے۔ بنے بھائی نے اسی زبان میں یہ برہا لکھا تھا اور ہم لوگ بمبئی میں مزدوروں کے جلسوں میں اسے مل کر گاتے تھے۔ خود بنے بھائی بھی گانے میں شریک ہوتے تھے۔ میں نے کہا کہ 'کہاں آپ کا وہ برہا اور کہاں یہ چبائے ہوئے نوالے جن میں نہ تخیل و جذبات کی ندرت ہے اور نہ واردات قلبی کی تڑپ اور چبھن۔ آپ بہتر یہی ہے کہ صرف نثر نگاری پر اکتفا کریں، آپ کی نثر میں بڑی مٹھاس اور دلکشی ہوتی ہے۔ شاعری کے جھگڑے میں نہ پڑیں'۔ بنے بھائی ہنسنے لگے۔ اُن کو میری یہ باتیں ضرور بری لگی ہوں گی کیونکہ کسی ماں کو بھی اپنے بدصورت سے بدصورت بچے کی برائی اچھی نہیں لگتی۔ مگر وہ ہنسنے لگے اور بولے 'تم دراصل مجھ سے جلتے ہو۔ تم خود تو ایک مصرع موزوں نہیں کر سکتے اس لیے چاہتے ہو کہ تمہاری طرح میں بھی کبڑا ہو جاؤں'۔

پھر بنے بھائی ہندوستان چلے گئے۔ ہم سب کو ان کے جانے کا بہت دکھ ہوا۔ اُن کی موجودگی سے ہمیں بڑی ڈھارس رہتی تھی، جیسے کوئی اپنا بزرگ اور سرپرست سایہ کیے ہوئے ہو

اور یہ سایہ اچانک ہم سے چھن جائے۔ ان کے پاس بیٹھ کر بڑی اپنائیت محسوس ہوتی تھی اور بڑا سکون ملتا تھا۔ انسان اپنے تمام دکھ درد بھول جاتا تھا۔ قدرت نے ان کو نہایت دردمند دل اور نہایت معاملہ شناس ذہن عطا کیا تھا۔ وہ فوراً بھانپ جاتے تھے کہ اس وقت یہ شخص کن ذہنی یا جذباتی یا دنیاوی پریشانیوں میں مبتلا ہے۔ وہ بڑی محبت اور بڑے پیار سے دوسروں کی باتیں سنتے اور نہ کبھی نصیحت کرتے اور نہ لیکچر دیتے بلکہ مداوا ممکن ہوتا تو چارہ گری کی پوری کوشش کرتے ورنہ بڑی ہمدردی سے غم غلط کرنے کی راہیں نکال لیتے۔ ہم ان کے پاس سے اٹھتے تھے تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ اپنے غموں کا سارا بوجھ اُن کے پاس چھوڑ آئے ہیں۔ اس لیے مجھے ان سے اپنی ذاتی الجھنیں بیان کرنے میں کبھی جھجھک محسوس نہیں ہوئی۔

سیاسی مصروفیتوں کے باوجود بنے بھائی ادب اور آرٹ کے تمام عمر گرویدہ رہے۔ وہ کام کرتے کرتے تھک جاتے تو میر، غالب یا حافظ کی کلیات اٹھا کر پڑھنے لگتے تھے۔ اور جہاں کہیں کوئی اچھا شعر ملتا تو دوسروں کو سنائے بغیر نہ رہتے۔ ایک بار بمبئی میں غالب کا ذکر چھڑا تو کہنے لگے کہ یار کیا خیال ہے یہاں یوم غالب کیوں نہ منایا جائے۔ بمبئی جیسے کاروباری شہر میں یوم غالب کا تصور ہمیں کچھ عجیب سا لگا۔ ہم نے کہا بنے بھائی یہاں غالب کو سننے اور سمجھنے والے کہاں ملیں گے۔ کہنے لگے تم لوگوں کی یہی رعونت تو ساری خرابیوں کی جڑ ہے تم لوگ اپنے سوا کسی کو نہ تو صاحبِ ذوق سمجھتے ہو اور نہ ادب شناس۔ تمہارا خیال ہے کہ یہاں جو لاکھوں اردو بولنے والے آباد ہیں اور درجنوں ایسے کالج اور اسکول ہیں جن میں اردو اور فارسی کی تعلیم دی جاتی ہے اور ادبی انجمنیں قائم ہیں تو ان کو غالب کی خبر نہیں ہے۔ بس تمہی لوگوں نے غالب پڑھا ہے اور تمہی ان کے اشعار سمجھتے ہو۔

خیر صاحب یوم غالب کا پروگرام بنا۔ غالب کے طرف داروں کی فہرست مرتب ہوئی، اور بنے بھائی نے ان لوگوں کو اپنے گھر چائے پر مدعو کیا۔ ترقی پسند ادیبوں کے علاوہ سید عبداللہ بریلوی، ایڈیٹر 'بمبئی کرانیکل'، سید نجیب اشرف ندوی اسماعیلیہ کالج اندھیری کے

اردو، فارسی کے استاد، دستوی صاحب صابو صدیق انسٹی ٹیوٹ کے پرنسپل، حکیم حیدر بخش دہلوی، معین الدین حارث ایڈیٹر 'اجمل'، خلافت ہاؤس سے مولانا شوکت علی مرحوم کے بیٹے زاہد علی غرضیکہ اچھا خاصا نمائندہ جمگھٹا تھا۔ سب لوگوں نے بنّے بھائی کی تجویز کو پسند کیا اور طے پایا کہ ۱۶؍فروری ۱۹۴۴ء کو یوم غالب منایا جائے۔ صدارت کے لیے قاضی عبدالغفار کا نام منظور ہوا۔ مجھے اس بزم غالب کا سکریٹری مقرر کیا گیا۔

بنّے بھائی کے ساتھ کام کرنے میں بڑا مزا آتا تھا۔ اپنے رفیقوں کی صلاحیتوں کو پرکھنا اور ان میں کام کی لگن پیدا کرنا بنّے بھائی کو خوب آتا تھا۔ ان کی تعریف کرنا اس طرح کہ اُن کا دل بڑھے، بنّے بھائی کا خاص وصف تھا۔ یوم غالب کے موقع پر ہم لوگوں نے سولہ صفحے کا ایک جیبی انتخاب شائع کیا۔ سرورق پر غالب کی مروّجہ تصویر اور ولادت اور وفات کی تاریخیں ایک یا دو صفحے اُن کے حالاتِ زندگی، ایک یا دو صفحے میں اُن کی نثر کا نمونہ اور اشعار کا انتخاب، ایک صفحہ پر اُن کی تصنیفات کی فہرست، اور پشت پر یوم غالب کا پروگرام۔ اس کتابچہ کی قیمت چار آنے رکھی گئی۔ یہ کتابچہ اتنا مقبول ہوا کہ یقین مانیے یوم غالب کے اخراجات اسی کتابچے سے نکل آئے۔ پھر تو بنّے بھائی نے ہمارا وہ مذاق اڑایا کہ نہ پوچھیے۔ جب ہم نے بتایا کہ ہم لوگوں نے یہ جیبی انتخاب بیچ کر اتنی رقم جمع کی ہے تو معصومیت سے پوچھنے لگے کہ یہ کتابچہ کن لوگوں نے خریدا۔ ہم نے خوش ہوکر کہا کہ یہی محمد علی روڈ، بھنڈی بازار اور کرافورٹ مارکٹ کے دکانداروں اور کالج کے طلبہ نے۔ کہنے لگے اچھا! میں تو سمجھا تھا کہ آپ لوگوں نے اسے دہلی اور لکھنؤ کے زباں دانوں میں فروخت کیا ہوگا۔ ورنہ یہاں بمبئی کے جہلا کو غالب سے کیا دلچسپی۔ تب ہم ان کے طنزیہ فقروں کے مفہوم تک پہنچے۔ ہم نے کہا چھوڑیے بھی آپ کیا پرانی باتیں لیے بیٹھے ہیں۔ کہنے لگے نہیں، میں مذاق نہیں کررہا ہوں میں بڑی سنجیدگی سے چاہتا ہوں کہ تم لوگ اپنے رویے پر خود تنقید کرو اور دیکھو کہ اس احساس برتری کی وجہ سے تمہاری Cause کو کتنا نقصان پہنچ سکتا ہے۔ تمہارے اپنے

تجربے نے ثابت کر دیا کہ تم لوگ غلطی پر تھے۔ عام اردو داں طبقہ ممکن ہے کہ غالب کے تمام اشعار کی بلاغتوں کی تہہ تک نہ پہنچ سکتا ہو لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں کہ وہ غالب کو پسند نہیں کرتا یا غالب کے اشعار اُس کی سمجھ سے باہر ہیں۔

یوم غالب بہت کامیاب رہا۔ غالباً بمبئی کے لوگوں نے اس سے پیشتر اس نوع کی کوئی تہذیبی تقریب نہیں دیکھی تھی۔ کچھ عرصے کے بعد بنّے بھائی نے یوم شبلی منانے کا منصوبہ بنایا۔ یوم غالب کی کامیابی سے ہمارے حوصلے بہت بڑھ گئے تھے۔ بہت سے نئے نئے رضا کار بھی مل گئے تھے۔ کچھ نوجوان جرنلسٹ، کچھ کالج کے طلبہ، اور اب ہمارا حلقہ بہت وسیع ہو گیا تھا۔

مولانا شبلی نعمانی قل آعوذیہ ملاّ نہ تھے بلکہ نہایت خوش ذوق ادیب اور روشن خیال عالم تھے۔ بمبئی سے اُن کو خاص لگاؤ تھا۔ اس لیے کہ ان کے جذبات کی مرکز محترمہ عطیہ بیگم بمبئی میں رہتی تھیں۔ عطیہ بیگم علامہ اقبال کی ہم عصر تھیں اور لندن میں وہ اور اقبال ایک ہی زمانے میں تھے۔ علامہ شبلی نے عطیہ بیگم کو مخاطب کر کے جو اشعار لکھے ہیں وہ کلیات شبلی میں موجود ہیں۔ پھر عطیہ بیگم کے نام علامہ شبلی کے خطوط بھی شائع ہو چکے ہیں۔ عطیہ بیگم کی شہرت کا آفتاب مدت ہوئی ڈھل چکا تھا۔ اُن کی امیرانہ شان و شوکت بھی ختم ہو چکی تھی۔ اب وہ ایک اَدھیڑ عمر کی خاتون تھیں اور وارڈن روڈ پر ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتی تھیں۔ ہم لوگوں کو خیال گزرا کہ یوم شبلی کے موقع پر ان محترمہ کا تعاون حاصل کیا جائے کیونکہ ہمیں یقین تھا کہ ان کے پاس اب بھی علامہ شبلی کے غیر مطبوعہ خطوط اور دوسرے نوادر محفوظ ہوں گے۔ لیکن ہم میں سے کوئی عطیہ بیگم سے واقف نہ تھا۔ ہم نے مولانا نجیب اشرف ندوی سے جن کی شہر کے علمی اور ادبی حلقوں میں بڑی رسائی تھی، ذکر کیا تو انھوں نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ نہیں جناب، مجھ میں اس کی تاب نہیں ہے۔ اتفاقاً اس کا تذکرہ صفیہ سے ہوا تو انھوں نے کہا 'چلو میں ملا دیتی ہوں۔ میرے ان سے خاندانی تعلقات ہیں البتہ یہ بی بی تم

لوگوں کا دماغ چاٹ جائیں گی۔ وہ اپنی کہیں گی تمہاری بالکل نہ سنیں گی۔' عطیہ بیگم ان دنوں تھری آرٹ سرکل کے نام سے ایک تہذیبی مرکز چلا رہی تھیں۔ ہم لوگ صفیہ کے ہمراہ، عطیہ بیگم سے ملنے گئے اور اپنا مدعا بیان کیا تو وہ ہم لوگوں کو ایک برآمدے میں لے گئیں۔ وہاں لکڑی کا ایک بہت بڑا صندوق رکھا تھا۔ اس صندوق کی طرف اشارہ کرکے کہنے لگیں کہ 'مولانا شبلی کا سارا اثاثہ اس میں بند ہے۔ لیکن میں تم لوگوں کو ایک چیز بھی نہیں دوں گی اس لیے کہ آج کل کے نوجوان بڑے ہی غیر ذمہ دار ہوتے ہیں۔' (بے چارے نوجوان، ان کو لوگ ہر دور میں اس لقب سے یاد کرتے ہیں)۔ ہم نے کہا کہ 'آپ کو کوئی ذاتی تجربہ نوجوانوں کی غیر ذمہ داری کا ہے کہنے لگیں نہیں میں بھلا ان کو اپنے پاس پھٹکنے دیتی ہوں۔ مگر میں جانتی ہوں کہ یہ لوگ غیر ذمہ دار ہوتے ہیں'۔ لطف یہ ہے کہ ان کا یہ تہذیبی مرکز نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں ہی کی بدولت تھوڑا بہت چلتا تھا۔ خیر صفیہ نے ہماری بڑی وکالت کی اور وعدہ کیا کہ میں سب چیزیں واپس کردوں گی اس کے باوجود محترمہ ہم لوگوں کو کئی دن تک دوڑاتی رہیں اور تب بڑی مشکل سے انھوں نے علامہ شبلی کے چند غیر مطبوعہ خطوط اور دو یا تین تصویریں عنایت کیں۔ ہم نے ان سے جلسے کی صدارت کی بھی درخواست کی لیکن انھوں نے انکار کردیا۔ البتہ جلسے میں شرکت کا وعدہ کیا۔ یوم شبلی انجمن اسلام کے ہال میں منایا گیا۔ اتفاق سے اُن دنوں ڈاکٹر ذاکر حسین، جامعہ ملیہ دہلی کے سربراہ، بمبئی آئے ہوئے تھے ہم نے ان سے صدارت کی درخواست کی اور وہ راضی ہوگئے۔ اس جلسے میں ڈاکٹر اشرف مرحوم، بنّے بھائی، مولانا نجیب اشرف اور میں نے بھی تقریریں کیں یا مضامین پڑھے لیکن محفل کی یادگار کیفی اعظمی کی نظم تھی۔ کیفی اعظمی یوں تو بہت آہستہ بولتے ہیں اور ان کی صحت بھی ان دنوں اچھی نہ تھی۔ لیکن وہ شعر بہت گرج کر پڑھتے ہیں۔ یہ نظم بھی انھوں نے تحت اللفظ میں پڑھی تھی اور مولانا شبلی کی مشہور نظم چراغ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک، پر مصرعے لگائے تھے۔[1]

تھے بلکہ اس بات پر فخر کرتے تھے کہ ہمارے دربار میں ہر خیال اور عقیدے کے عالم اور ادیب جمع ہیں۔ امرائے دربار میں بھی آپس میں مقابلہ ہوتا تھا تو اس بات پر کہ زیادہ تر کس ملک کے فلاں فلاں شاعر، موسیقار اور مصور میرے ہم پیالہ و ہم نوالہ ہیں۔

لیکن یہاں ادیبوں اور فنکاروں کی سرپرستی تو الگ رہی اُن کے لیے جینا دوبھر کر دیا جاتا ہے۔ اُن کا شجرۂ نسب دیکھا جاتا ہے، اُن کے سیاسی خیالات کی چھان بین ہوتی ہے۔ اگر معلوم ہو کہ وہ ارباب اختیار کا ثنا خواں نہیں ہے اور کشکول گدائی لے کر اُن کے دروازے پر بھیک مانگنے کو عزتِ نفس کی تذلیل سمجھتا ہو تو پھر اُس کے لیے عرصۂ حیات تنگ ہو جاتا ہے۔

استاد بڑے غلام علی خان برصغیر کے سب سے بڑے موسیقار تھے۔ وہ پاکستان بڑی امیدوں سے آئے لیکن جوتیاں چٹخارتے پھرے۔ کسی نے انھیں منہ نہ لگایا اور بے چارے ہندوستان واپس چلے گئے۔ ان کا تو سیاست سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ ہندوستان میں ان کی وہ قدر ہوئی کہ گویا کسی سربراہِ مملکت کی ہوگی۔ قرۃ العین حیدر اس دور کی ممتاز ادیبہ ہیں۔ انھوں نے 'آگ کا دریا' ناول لکھا تو اُن پر وہ کیچڑ اُچھالا کہ وہ بھی دل شکستہ ہو کر بمبئی چلی گئیں۔

ممکن ہے یہ کہا جائے کہ سجاد ظہیر تو سیاسی لیڈر تھے اور ان کی ذات سے ملک کو بڑا خطرہ تھا۔ مگر یہی خطرناک سجاد ظہیر جب ہندوستان واپس گئے اور کمیونسٹ پارٹی کی سیاسی سرگرمیوں میں مصروف ہوئے تب بھی حکومتِ ہند نے کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ ان کو ملک کی ادبی اکیڈمی کا رکن بنا دیا۔ ان کی پارٹی اور وہ خود حکومت پر اعلانیہ اعتراض کرتے رہے لیکن کسی نے اُن سے کبھی پوچھ گچھ نہ کی اور نہ ان کی نقل و حرکت پر کوئی پابندی لگائی۔ وہ اپنے علمی اور ادبی مشاغل کے سلسلے میں ماسکو، لندن، ایران، افغانستان، مشرقی یورپ، مغربی یورپ کا سفر کرتے رہتے تھے۔ لیکن اُنہیں نہ تو کبھی No Objection سرٹیفکیٹ لینا پڑا

[illegible]

[illegible]

شکست کی پیش گوئیاں کرنے لگے تھے۔ لیکن امتیاز علی خان اس وقت بھی میخانوں اور روٴسا کے ایوانوں میں بیٹھ کر سرخ فوج کی فتح کی بشارت دیتے رہتے تھے۔ وہ تھے تو بڑے دبلے پتلے آدمی لیکن ان کی دلیری کا جواب نہ تھا۔ بنّے بھائی سے وہ بے پناہ محبت کرتے تھے اور وہ واحد آدمی تھے جن سے بنّے بھائی روپوشی میں بھی برابر ملتے رہتے تھے۔ وہ اگر دو تین روز بنّے بھائی سے ملنے نہ آتے تو بنّے بھائی اداس ہو جاتے۔ کہتے 'یار ذرا نواب کی خبر تو لو کئی دن سے نہیں آیا وہ آتا ہے تو شہر کے حالات معلوم ہوتے ہیں'، اور یہ واقعہ ہے کہ اپنے تمام لاابالی پن کے باوجود امتیاز بے حد باشعور اور باخبر انسان تھے۔ صبح بہت سویرے اٹھتے، دو تین میل ٹہلتے اور پھر تقریباً آدھا دن اخبار پڑھنے میں صرف کرتے۔ ہندوستان پاکستان کے تمام اچھے روزنامے ان کے پاس آتے تھے اور وہ سب کا اس طرح مطالعہ کرتے تھے جیسے کوئی طالب علم امتحان کے قریب نصابی کتابیں پڑھتا ہو۔ اس کے بعد وہ شہر کے دورے پر نکل جاتے تھے۔ جم خانہ کلب ان کی خاص بیٹھک تھی۔ یہاں بیٹھ کر وہ جو کچھ پڑھتے تھے اس پر دوسروں سے تبادلہ خیال کرتے تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ وہ اچھے خاصے انسائیکلو پیڈیا تھے اور جب وہ رات کے وقت عالم کیف میں جھومتے جھامتے بنّے بھائی کے پاس آتے تو بیچ بیچ کا دلچسپ داستان کھل جاتا۔ کون کس کے ساتھ مل کر سازش کر رہا ہے، کس کا ان دنوں کس سے یارانہ ہے، کس کا کس سے معاشقہ چل رہا ہے۔ غرض یہ کہ درمیانہ اور اونچے طبقے کی زندگی کے تمام پہلو نواب زادہ صاحب کے تبصرے کا موضوع بن جاتے۔

وہ کرخنی بولی بولتے تھے۔ یعنی اکثر الفاظ مشدد ہوتے تھے۔ مثلاً روٹی کو وہ 'روٹ ٹی' کہتے اور 'دھان' کو 'دھانّ' کہتے تھے۔ تم کی جگہ وہ 'تو' بولتے تھے 'میں کہتا ہوں' کی جگہ وہ 'میں کہوں ہوں'، یہ تمی میری طرح 'آئے ہے جائے ہے'۔ ان کے منہ سے یہ زبان اتنی پیاری لگتی تھی۔ ہم ان کی باتیں بڑے شوق سے سنتے تھے۔ جب ننھے بھائی پر بہت پیار آتا تو کہتے 'یار بنّے تو یہاں ان جھمیلوں میں پڑ گیا۔ چل میرے ساتھ رہ، قصہ کو طے کر کے

اور عیش کریں گے۔' اور واقعی وہ کبھی کبھار بنّے بھائی کو زبردستی اپنے گھر اٹھا لے جاتے تھے۔ ہم نے ایک دو بار دبے لفظوں میں کہا بھی کہ 'نواب تیرا گھر تو چھجو کا چوبارہ ہے، سرکاری افسر، پولیس والے، وکیل اور دنیا بھر کے اوباش، مفت خورے تیرے پاس آتے رہتے ہیں۔ کسی کو اگر بھنک لگ گئی تو بنّے بھائی کے ساتھ تو بھی اندر ہوگا اور تیری جائیداد بھی ضبط ہوجائے گی'، اور بنّے بھائی کہتے کہ 'نواب تیری تو حرکتیں ایسی ہیں کہ تو تو ایک دن بھی جیل میں نہیں کاٹ سکتا۔ معافی مانگ کر آ ئے گا'۔ امتیاز گرج کر کہتا 'لیاقت کی کیا مجال ہے جو میرے گھر پر چھاپہ مارے، ذرا کوئی پولیسیا میرے پھاٹک میں داخل ہو کر تو دیکھے'۔ (حالانکہ ان دنوں امتیاز کے خاندان کے تعلقات نوابزادہ لیاقت علی مرحوم کے ساتھ خوشگوار نہ تھے۔)

اپریل ۵۱ء میں جن دنوں پولیس بنّے بھائی کو تلاش کررہی تھی تو دو تین بار امتیاز علی خان کی کوٹھی پر بھی چھاپے پڑے اور خود پولیس کے افسروں نے بعد میں مجھ سے نواب کے نڈر پن کی تعریف کی۔ وہ پولیس کو گھر کی تلاشی سے تو نہ روک سکا لیکن اس نے حکومت اور پولیس کو ایسی کھری کھری سنائیں کہ تلاشی لینے والے اس کے فقرے کبھی نہ بھولے۔ بنّے بھائی جب گرفتار ہو کر حیدرآباد جیل گئے تو اُن کے کسی قریبی رشتہ دار کی جرأت بھی نہ تھی جو اُن کو خط لکھتا یا ان سے ملنے کی کوشش کرتا۔ البتہ امتیاز وہ واحد شخص تھا جو بے خوف و خطر حیدرآباد جاتا اور بنّے بھائی سے ملاقات کرتا۔ البتہ خط اس نے کبھی اپنی بیوی کو نہ لکھا تو بنّے بھائی کو کیا لکھتا۔

ستمبر یا اکتوبر ۵۳ء میں قاضی عبدالغفار مرحوم نے حیدرآباد میں اردو کانگریس کے نام سے ایک نئی تنظیم کی طرح ڈالی۔ اس کی ابتدا ایک عظیم الشان کانفرنس سے ہوئی۔ اس کانفرنس میں بنّے بھائی سردار جعفری، کیفی اعظمی اور مجھے بھی مدعو کیا گیا تھا۔ کانفرنس کے اجلاس میں شرکت کے لیے ہندوستان کے سب ہی گوشوں سے اردو زبان کے عالم اور ادیب آئے ہوئے تھے۔ اجلاس باغ عامہ کی عالیشان عمارت میں ہونا تھا۔ باغِ عامہ سرکاری باغ

تھا جو درختوں اور پودوں کے انتخاب میں اپنی مثال آپ تھا۔ باغ کے بیچ میں ایک بہت بڑی جھیل تھی جو کنول کے پھولوں سے ڈھکی رہتی تھی۔ جھیل میں سیاہ رنگ کے ہنسوں کا ایک جوڑا تیرتا رہتا تھا۔ جھیل سے ملی ہوئی ایک دومنزلہ عمارت تھی جس کے ہال میں کم از کم ایک ہزار حاضرین سما سکتے تھے۔ مندوبین کے قیام کا انتظام بشیر باغ میں کیا گیا تھا۔ بشیر باغ شاہی محل تھا اور شاید پہلی بار اس میں اُن لوگوں کو ٹھہرنا نصیب ہوا تھا جن کو شاید پھاٹک کے اندر داخل ہونے کی اجازت بھی نہ مل سکتی تھی۔ دیوار سے دیوار تک ایرانی قالین، ریشمی پردے، بڑی بڑی نقشی مسہریاں، جن پر بیٹھو تو محبوبہ کی آغوش کا گمان ہوتا تھا۔ چھتوں پر جھاڑ فانوس، ہر کمرے سے ملا ہوا غسل خانہ جس میں ہر وقت ٹھنڈا گرم پانی آتا تھا۔ ہر کمرے کے سامنے ایک عدد چوبدار جس کا منہ جی تقسیر، تقسیر کہتے نہ تھکتا تھا۔ نہایت پر تکلف کھانے، سواری کے لیے موٹروں کی ایک قطار ہر وقت کھڑی ہوئی۔ یہ ساری شان وشوکت دیکھ کر ہم لوگ کبھی دولت کی فراوانی پر عش عش کرتے اور کبھی اپنی بے سروسامانی پر ہنستے۔ ہم میں سے کئی حضرات کو تو گرم اور ٹھنڈے پانی کی دھاروں کو ملانا بھی نہ آتا تھا۔ کبھی غلطی سے اُبلتا ہوا پانی جسم پر ڈال لیتے تھے اور کبھی ٹھنڈے پانی ہی پر اکتفا کرتے تھے۔ مجبوراً بنے بھائی سے اپنی جہالت کا ذکر کرنا پڑا تو وہ ہنسے اور کہنے لگے کہ "کن گداگروں کو قاضی صاحب نے مدعو کیا ہے، انھیں غسل خانہ استعمال کرنے کی بھی تمیز نہیں ہے"۔ یہ کہہ کر اٹھے اور ہم لوگوں کو غسل خانہ میں لے کر چلے گئے اور گرم اور ٹھنڈے پانی کو ملا کر استعمال کرنے کی ترکیب بتائی۔

بنے بھائی میں ایک عجیب عادت یہ تھی کہ وہ لکھنے کے کام کو آخری لمحے تک ٹالتے رہتے تھے۔ اس کی وجہ ان کی فطری کاہلی نہ تھی بلکہ لکھنے سے پہلے ان کا زیادہ وقت سوچنے پر صرف ہوتا تھا۔ چنانچہ اردو کانگریس کے موقع پر بھی یہی افتاد پڑی۔ بنے بھائی نے اپنے مقالے کے اس وقت تک شاید دو یا تین صفحے لکھے تھے۔ دوسرے دن کانفرنس شروع ہونے

والی تھی۔ اُن کا خیال تھا کہ ایک دن میں وہ اپنا مقالہ مکمل کرلیں گے لیکن بشیر باغ میں ادیبوں کا جمگھٹا تھا ان کے علاوہ حیدرآباد کے ادیب اور احباب بھی ملاقات کے لیے چلے آرہے تھے۔ بنّے بھائی کے لیے نہیں کہنا بہت مشکل ہوتا تھا۔ اصولی بات ہو تو وہ بلا جھجک دوٹوک بات کرتے تھے اور کوئی لگی لپٹی نہیں رکھتے تھے۔ لیکن ذاتی معاملات میں وہ کسی سے یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ صاحب اب آپ تشریف لے جائیں مجھے کام کرنا ہے۔ بدقسمتی سے یا خوش قسمتی سے وہ دوسرے روز بیمار ہوگئے اور ان کے ایک دوست جو آکسفورڈ میں ان کے ہم سبق تھے اور اب حیدرآباد میں ہائی کورٹ کے جج ہیں انھیں زبردستی اپنے گھر اٹھا لے گئے۔ بشیر باغ میں نہ تو وہ اپنا مقالہ مکمل کرپاتے اور نہ شاید اتنی جلدی صحت یاب ہوسکتے تھے۔

یہ آخر سمے مضمون مکمل کرنے کی لت ان سے آخر دم تک نہ چھوٹی۔ اشک آباد بھی وہ اسی طرح اپنا مقالہ تیار کیے بغیر پہنچے۔ صبح کے اجلاس میں تو وہ جبراً قہراً شریک ہوئے لیکن سہ پہر کے اجلاس کو وہ گول کرجاتے۔ ہم لوگ جب بھی کہتے کہ چلیے بنّے بھائی اجلاس کا وقت ہوگیا ہے۔ تو بڑی معصومانہ حجت سے جواب دیتے کہ بھائی تم لوگ جاؤ مجھے تو اپنا مقالہ مکمل کرنا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان کی آخری تحریر وہی مقالہ تھا جو انھوں نے دس ستمبر ۷۳ء کو یونیسکو کے اجلاس میں پڑھا۔ یہ مقالہ انگریزی زبان میں تھا۔ اور اس کا موضوع ترقی پسند ادب کی تحریک تھا۔

بنّے بھائی سے میری آخری ملاقات اشک آباد ہی میں ہوئی۔ اشک آباد سوویت جمہوریہ ترکمانستان کا دارالحکومت ہے۔ شہر کیا ہے صحرا میں ایک نخلستان ہے۔ چوڑی چوڑی سڑکیں، راہگیروں کے لیے دو رویہ فٹ پاتھ تھے۔ سڑکوں کے بیچ میں سرو، چنار کے درخت۔ سڑکوں کے دونوں طرف اونچے اونچے چھتنار درختوں کی دو رویہ قطاریں کہ سورج کی کرنیں بھی مشکل سے زمین تک پہنچ پاتی تھیں۔ عمارتیں جدید اور قدیم طرز تعمیر کی آمیزش کا بہترین نمونہ تھیں۔ عمارتوں کو باہر سے دیکھو تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ ہم سترھویں یا اٹھارہویں

صدی کے مغلیہ عہد میں ہیں۔ وہی محراب و ستون، وہی منبت کاریاں، نیلی اور پیلی روغنی اینٹوں کی چنائی، دیواروں پر اُبھرے ہوئے بیل بوٹے، چوڑے چوڑے دالان، اونچی اونچی چھتیں اور کشادہ پھاٹک، البتہ اندر سے دیکھو تو وہ تمام سہولتیں اور آسائشیں موجود جو صنعتی دور کی نعمتیں ہیں۔

اشک آباد کوہ کے دامن میں واقع ہے۔اسی مقام پر یونیسکو کی طرف سے کانفرنس کا موضوع تھا 'وسطی ایشیا میں اُنیسویں اور بیسویں صدی کے تہذیبی، علمی اور ادبی رجحانات'۔ وسطی ایشیا سے منتظمین کی مراد وہ خطہ ہے جو ترکی سے ہندوستان تک پھیلا ہوا ہے۔ اس میں پاکستان، ہندوستان، افغانستان اور سوویت یونین کی ایشیائی جمہوریتوں ، قازقستان، تاجکستان، ازبکستان، ترکمانیہ، جارجیہ، آذربائیجان، داغستان، وغیرہ کے نمائندے شریک ہوئے تھے۔ میزبانی کے فرائض اکیڈمی آف سائنسز نے انجام دیے تھے۔ پاکستان کے مندوبین میں، میں بھی شامل تھا۔ اور میری دلی خواہش تھی کہ کاش ہندوستان کے مندوبین میں بنّے بھائی ہوں تو اسی بہانے اُن سے ملاقات ہوجائے ورنہ پچھلے سترہ سال میں نہ مجھے ہندوستان جانے کی اجازت ملی اور نہ بنّے بھائی پاکستان آسکے۔ میں ماسکو پہنچا تو سب سے پہلے سوال میں نے میزبانوں سے اور اپنے دوستوں سے یہی کیا کہ کیا بنّے بھائی بھی آئے ہیں لیکن سب نے لاعلمی ظاہر کی اور کہا کہ ممکن ہے کہ ہندوستانی نمائندے دہلی سے تاشقند کے راستے سیدھے اشک آباد چلے گئے ہوں۔ اشک آباد میں تمام مندوبین ہوٹل اشک آباد میں ٹھہرائے گئے تھے۔ میں ہوٹل میں داخل ہوا تو ابھی میں ہوٹل والوں سے اپنے کمرے کی کنجی اور کانفرنس سے متعلق کاغذات لے رہا تھا کہ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ فیض صاحب ایک جانب سے خراماں خراماں چلے آرہے ہیں۔ وہ ماسکو سے مجھ سے ایک دن پہلے اشک آباد آگئے تھے۔ ہم لوگ بڑی گرمجوشی سے بغلگیر ہوئے حالانکہ ہمیں الگ ہوئے مشکل سے چوبیس گھنٹے ہی گزرے ہوں گے۔ لیکن پردیس میں کسی پرانے رفیق اور ہم وطن کے ملنے

سے جو خوشی ہوتی ہے وہ واقعی مسیحا اور خضر کی ملاقات سے بھی کہیں زیادہ خوشی کا باعث ہوتی ہے۔ میں نے فیض سے بھی چھوٹتے ہی یہی پوچھا کیا بنّے بھائی آئے ہیں۔تو انھوں نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اُدھر کھانے کے ہال میں بیٹھے ہیں، چلے جاؤ۔ میں نے سامان وہیں چھوڑا اور بھاگتا ہوا کھانے کے ہال میں پہنچا دیکھا کہ بنّے بھائی دربار لگائے بیٹھے ہیں۔ بڑے پیار سے ملے، گلے لگایا، پیار کیا اور پھر ہم نم ناک آنکھوں سے دیر تک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔اشک آباد کے وہ آٹھ دن مجھے کبھی نہ بھولیں گے۔ ہم لوگ ایک ساتھ ناشتہ کرتے، ایک ساتھ کھانا کھاتے، تہذیبی تقریبوں اور دعوتوں میں ایک ساتھ جاتے۔ وہ پاکستان کے حالات کھود کھود کر پوچھتے اور اپنے پرانے ساتھیوں اور دوستوں کا ذکر بڑے پیار سے کرتے۔ انھوں نے کئی بار کوشش کی کہ پاکستان اور ہندوستان کے مندوبین الگ بیٹھ کر تبادلہ خیال کریں لیکن انھیں بڑی مایوسی ہوئی۔ کہنے لگے 'لڑائیاں دوسرے ملکوں میں بھی ہوئی ہیں۔ جرمنی اور فرانس صدیوں تک لڑتے رہے ہیں لیکن ادھر جنگ بندی ہوئی ، ادھر تعلقات معمول پر آ گئے۔ لوگوں کی آمدورفت جاری ہوگئی۔ سرحدیں کھل گئیں۔ اخبار اور رسالے اور تجارتی مال کا تبادلہ ہونے لگا لیکن ہم دنیا کے نرالے ہمسایہ ملک ہیں کہ ہمارے دل ہی ایک دوسرے سے صاف نہیں ہوتے۔بات چیت بھی گوارہ نہیں کرتے۔اب تم ہی بتاؤ کہ یہاں کون سی سیاسی مصلحتیں مانع ہیں۔ ہم لوگ نہ وزیر نہ سفیر پھر مل بیٹھنے سے کون سا آسمان سر پر آ رہے گا۔ ارے بھئی سیاسی باتیں نہ کرو۔ غالبؔ ، میرؔ، اقبالؔ ہی کی باتیں کرو۔ اردو، فارسی ہی کی باتیں کرو۔ مگر نہیں صاحب اگر ہم آپس میں ملے تو ڈر ہے کہ کہیں ہندوستان اور پاکستان کی آزادی اور خود مختاری پر حرف آئے گا۔ دونوں بھیک کا برتن لیے ملک ملک گھومتے ہیں۔ اس وقت قومی عزت کا ذرا بھی خیال نہیں آتا۔ چار آدمی ایک ساتھ بیٹھ جائیں گے تو آزادی خطرے میں پڑ جائے گی۔ آزادی نہ ہوئی بچوں کا کھیل ہوگئی۔'

کانفرنس کے بعد ان کا پروگرام ایک ہفتے کے لیے دوشنبے (تاجکستان کا صدر مقام) جانے کا تھا۔ ان کا اصرار تھا کہ تم بھی چلو۔ چنانچہ ایک دن کانفرنس سے پہلے انھوں نے مجھے پروفیسر بابا جان غفوروف سے ملایا۔ بابا جان غفوروف تاجیک ہیں۔ ان کی مادری زبان فارسی ہے۔ اس لیے اُن سے ترجمان کے بغیر گفتگو ہوئی۔ وہ انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز، ماسکو کے ڈائریکٹر ہیں۔ بڑے عالم فاضل بزرگ ہیں۔ اس کانفرنس کے روح رواں دراصل وہی تھے۔ بنّے بھائی نے کہا کہ یہ میرا چھوٹا بھائی ہے۔ ہم سترہ سال کے بعد ملے ہیں۔ ایسا ہے ویسا ہے۔ غرضیکہ تعریفوں کے پل باندھ دیے۔ بابا جان بڑی محبت سے ملے۔ بنّے بھائی نے کہا کہ میں اسے دوشنبے لے جانا چاہتا ہوں۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں۔ وہ بولے شوق سے لے جاؤ میں ان کا بھی سارا انتظام کروں گا۔ بات پکی ہوگئی۔

لیکن کانفرنس ختم ہونے سے ایک دن پہلے مجھے پاکستانی سفارت خانے سے پیغام ملا کہ تم فوراً ماسکو پہنچو، وہاں ایک اور کانفرنس ہے۔ اس میں تمہیں اور ڈاکٹر نذیر احمد کو شریک ہونا ہے۔ بنّے بھائی کو سارا ماجرا سنایا تو انھیں بڑی مایوسی ہوئی۔ کہنے لگے 'ہم نے سوچا تھا کہ دوشنبے میں آرام سے باتیں ہوں گی۔ مگر کانفرنس میں شرکت مقدم ہے۔ تم وہاں سے دوشنبے آجاؤ میں تمہارا انتظار کروں گا۔'

لیکن افسوس ہے کہ میں دوشنبے نہ جاسکا کیونکہ کانفرنس کے منتظمین نے ہمارے لیے تاشقند، سمرقند اور بخارا کا دورہ مقرر کردیا تھا اور اس پروگرام میں تبدیلی ممکن نہ تھی۔

حواشی

۱

سلام اے ملت اسلامیاں کے نوحہ خواں شبلی
مبارک ہو کہ کروٹ لے رہا ہے آسماں شبلی

سجاد ظہیر

۱۹۷۳ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے روح رواں سید سجاد ظہیر کے انتقال پر سبط حسن صاحب نے زیرِ نظر دو مضامین سپردِ قلم کیے۔ پہلا مضمون انگریزی روزنامہ 'ڈان' کراچی میں شائع ہوا جبکہ دوسرا مضمون انھوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین، ادارۂ یادگارِ غالب اور ینگ رائٹرز فورم کے زیرِ اہتمام تعزیتی جلسے منعقدہ غالب لائبریری میں پڑھا۔ انگریزی مضمون کا ترجمہ اور تعزیتی جلسے میں پڑھا جانے والا مضمون ماہنامہ 'طلوعِ افکار' کراچی کے 'سجاد ظہیر' نمبر (نومبر ۱۹۷۳ء) میں شائع ہوئے۔ یہ دونوں مضامین موجودہ مرتب کی ہی مرتب کردہ سبط حسن کی ایک اور کتاب 'ادب اور روشن خیالی' (مطبوعہ، کراچی: مکتبہ دانیال) میں بھی شامل ہیں۔ (مرتب)

انجمن ترقی پسند مصنفین کے بانی سجاد ظہیر کی اچانک موت نے ایک ایسی پیاری شخصیت کو ہمارے درمیان اور اردو ادب کے میدان سے اٹھا لیا ہے جس کی خدمات جدید اردو ادب کی نشو و نما کے سلسلے میں ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ ان کا انتقال ایسے وقت میں ہوا جب وہ افریقی اور ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس (منعقدہ الما آتا) میں شرکت کر رہے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ افریقہ اور ایشیا کے ادیبوں کا اتحاد اور ان کی یکجہتی سجاد ظہیر کو ہمیشہ بے حد

عزیز تھی۔

گذشتہ ایک سال سے وہ برصغیر کے اردو کے اوّلین اور فارسی کے اہم اور منفرد شاعر امیر خسروؔ کی زندگی اور ان کی شاعری کے بارے میں لندن، برلن، ماسکو، تاشقند، کابل اور ہندوستان کے کونے کونے سے مواد جمع کر رہے تھے۔ اس لیے کہ امیر خسروؔ کی چھٹی صد سالہ برسی پوری دنیا میں ۱۹۷۵ء میں منائی جائے گی۔

سجاد ظہیر لکھنؤ چیف کورٹ کے چیف جج سر سید وزیر حسن کے چوتھے بیٹے تھے۔ انھوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے بی اے پاس کیا اور ۱۹۳۵ء میں بیرسٹر بن گئے مگر انھوں نے نہ کبھی وکالت کی اور نہ کوئی ملازمت بلکہ اپنا تمام وقت سیاسی اور ادبی سرگرمیوں کی نذر کر دیا۔ ۱۹۳۷ء میں ان کی شادی اردو کی مشہور افسانہ نگار اور ناول نگار رضیہ سجاد ظہیر سے ہوئی۔

انگلستان کے قیام کے دوران میں انھوں نے سامراجیت کے خلاف تحریکوں میں کھل کر حصہ لیا اور سوشلزم سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ سجاد ظہیر بنیادی طور پر ادبی مزاج رکھتے تھے۔ چنانچہ لندن میں ان کے تعلقات آڈن، لوئس میکینس، اسٹیفن اسپنڈر، رالف فوکس، جیک لنسے، ڈیوٹ گیسٹ، کنٹورتھ اور ملک راج آنند ایسے اہم ادیبوں اور شاعروں سے ہو گئے تھے جو اُن دنوں ترقی پسند رجحانات کے لیے مشہور تھے۔ سجاد ظہیر فرانسیسی اور انگریزی زبانوں پر پورا عبور رکھتے تھے۔ لیکن انھوں نے ہمیشہ اپنے خیالات کا اظہار اردو ہی میں کیا۔ اس لیے کہ انھیں اردو سے بڑا گہرا جذباتی لگاؤ تھا۔ لندن ہی میں انھوں نے اپنا مشہور و معروف ناول 'لندن کی ایک رات' لکھ لیا تھا جو آج بھی ویسا ہی تازہ اور مقبول ہے جیسا کہ اپنے ابتدائی دور میں تھا۔ اس ناول کے بعد انھوں نے کئی ایک بہت عمدہ افسانے بھی لکھے۔

ان کا دوسرا بڑا معرکہ آرا کام کہانیوں کے اس مجموعے کی ترتیب اور اشاعت تھا جسے 'انگارے' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس مجموعے میں پروفیسر احمد علی، ڈاکٹر رشید جہاں اور

ان کے میاں محمود الظفر کی کہانیاں بھی شامل تھیں۔ شائع ہوتے ہی اس کتاب نے پورے ملک میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ یہ کہانیاں آج کے دور میں تو بڑی بے ضرر سی معلوم ہوتی ہیں لیکن جس زمانے میں یہ کتاب چھپ کر سامنے آئی تھی اس وقت کے اردو پڑھنے والے ہمارے سماجی اور اخلاقی دوغلے پن کے متعلق ایسی کھری اور سخت تنقید پڑھنے کے عادی نہیں تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس کتاب پر روایت پرستوں نے بڑی لے دے کی یہاں تک کہ اس کتاب کی کہانی لکھنے والوں کو جان سے مار دینے کی دھمکیاں بھی دی گئی تھیں۔ بالآخر یو پی گورنمنٹ نے اس کتاب کو ضبط کرلیا۔

یہ دور پوری دنیا میں سیاسی، اخلاقی اور فکری اعتبار سے شدید بحران کا وقت تھا۔ ہٹلر انھی دنوں تازہ تازہ جرمنی کی مسند اقتدار پر آیا تھا اور اسپین کی جمہوری اور منتخب حکومت کا تختہ جنرل فرانکو اور اس کے حواریوں نے جرمنی کے نازی اور اٹلی کی فاشسٹ قوتوں کی مدد سے الٹ دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یورپ اور ایشیا کے آزادی اور جمہوریت پسند فطری طور پر اس شخصی اقتدار کی پھیلتی ہوئی وبا سے سخت مضطرب تھے۔ چنانچہ انھوں نے دنیا بھر کی ترقی پسند ادبی قوتوں کو منظم کیا تاکہ فرد کی آزادی اور اس کے جمہوری حقوق کا علم بلند رکھا جاسکے۔ اس پس منظر میں سجاد ظہیر اور ان کے ساتھیوں نے ایسے ادیبوں کی ایک تنظیم کی بنیاد ڈالی جو انسانیت کی مادی اور عقلی سربلندی کے حق میں نبرد آزما ہوسکتے تھے۔

۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین قائم کرنے سے پہلے سجاد ظہیر برصغیر کے تقریباً تمام ممتاز اہل علم اور ادیبوں اور شاعروں سے ملے اور ان سے اس مسئلے پر تبادلۂ خیال کیا۔ ان کے اس خیال کو علامہ اقبال، رابندر ناتھ ٹیگور، مولوی عبدالحق، منشی پریم چند، قاضی عبدالغفار، مسز سروجنی نائیڈو، میاں بشیر احمد، مولانا عبدالمجید سالک، مولانا غلام رسول مہر، صوفی غلام مصطفٰی تبسم، مولانا حسرت موہانی، مولانا چراغ حسن حسرت، جوش ملیح آبادی اور بہت سے دوسرے ادیبوں نے بے حد سراہا۔ ان کے اپنے ہم عمر اور ہم عصروں مثلاً فیض احمد

فیض، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، پروفیسر مجنوں گورکھ پوری، پروفیسر احمد علی، پروفیسر فراق گورکھ پوری، اختر شیرانی اور احمد ندیم قاسمی وغیرہم نے ان کی بھرپور حمایت کی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس لکھنؤ میں ۱۹۳۶ء میں اردو کے عظیم ناول نویس اور افسانہ نگار منشی پریم چند کی صدارت میں ہوئی۔ اس اجلاس میں سجاد ظہیر کو انجمن کا جنرل سیکریٹری منتخب کیا گیا اور بہت ہی مختصر عرصے میں انجمن نے اپنے آپ کو ایک حرکی قوت کے طور پر ثابت کردیا اور ہمارے ادب میں نئی اقدار کی آبیاری شروع کردی۔

۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۲ء نظر بندی کے دوران میں سجاد ظہیر نے سراج مبین کے نام سے بہت سے ادبی مضامین لکھے جو انجمن ترقی پسند مصنفین کے ترجمان رسالے 'نیا ادب' میں شائع ہوئے۔ رہائی کے بعد وہ بمبئی چلے گئے جہاں انھوں نے 'قومی جنگ' کی ادارت کے فرائض انجام دیے۔ اسی دوران میں وہ ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے رکن منتخب ہوئے۔ سجاد ظہیر نے اپنی سیاسی مصروفیتوں کے باوجود کبھی اردو ادب اور زبان کی خدمت سے غفلت نہیں برتی۔ یہ خدمت انھوں نے شروع ہی سے خود عائد کردہ فرض کے طور پر اپنائی تھی اور آخر تک وہ یہ فرض نہایت ذمہ داری اور لگن کے ساتھ پورا کرتے رہے۔ انھوں نے بمبئی کی تاریخ میں پہلی مرتبہ یوم غالب کا انتظام کیا اور بڑی شان سے منایا۔ اس کے کچھ ہی دنوں بعد انھوں نے اسی طرح یوم شبلی بھی منایا۔ ان دونوں تقریبات میں مختلف مدرسۂ فکر کے ادیبوں نے شرکت کی۔ واقعہ یہ ہے کہ فن اور ادب کے بارے میں سجاد ظہیر کے جذبات نہایت گہرے اور نازک تھے۔ ادیبوں کے بارے میں وہ ہمیشہ اتنے پرخلوص اور گرم جوش رہے کہ وہ ادیب بھی جو ان کے سیاسی مسلک سے شدید اختلاف رکھتے تھے نہ صرف ان کی دوستی اور ان کی رفاقت کا دم بھرتے تھے بلکہ ہمیشہ ان کے ادبی مقاصد کے بارے میں دست تعاون دراز کرتے تھے۔

۱۹۴۷ء کے آخر میں سجاد ظہیر پاکستان چلے آئے تھے لیکن ۱۹۵۱ء میں انھیں

راولپنڈی سازش کے مقدمے میں گرفتار کرلیا گیا۔ حیدر آباد اور مچھ جیل کی مشقت آمیز نظر بندی کے دوران میں سجاد ظہیر نے دو نہایت وقیع اور پائیدار ادبی اہمیت کی کتابیں لکھیں جن میں سے ایک فارسی کے عظیم شاعر حافظ شیرازی کی زندگی اور شاعری کا جائزہ اور تنقیدی مطالعہ ہے۔ اس کتاب کا نام 'ذکر حافظ' ہے۔ دوسری کتاب 'روشنائی' ہے جو ترقی پسند مصنفین کی تحریک کی ابتداء اور اس کے پھیلاؤ کی تاریخ بھی ہے اور ان بے سرو پا الزامات کی مدلل تردید بھی جو اس تحریک پر تھوڑے تھوڑے وقفے سے عائد کیے جاتے رہے ہیں۔ جیل میں نظر بندی کے عرصے میں انھوں نے کچھ نظمیں بھی لکھی تھیں جو حال ہی میں دہلی میں 'نیلم' کے نام سے ایک مجموعے کی شکل میں شائع ہوئی ہیں۔ ان نظموں میں اکثریت ان نظموں کی ہے جنھیں آج کل تجریدی شاعری کہا جاتا ہے۔ 'نیلم' کے دیباچے میں سجاد ظہیر نے نئی نسل کے جدید شعرا کے مسائل اور روایت پسندانہ اشاریت اور ڈکشن کی محدود نوعیت پر بڑی اہم تنقیدی بحثیں اٹھائی ہیں۔ اس لیے کہ ان کے خیال میں آج کل کے نوجوان شاعر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے بالعموم روایتی سمبلز اور ڈکشن کو عہد جدید کی روح کی گرفت اور احاطہ نہ کرنے کے شاکی نظر آتے ہیں۔

سجاد ظہیر کو ۱۹۵۵ء میں مچھ جیل سے رہا کردیا گیا تھا۔ لیکن فوراً ہی انھیں ہندوستان بھجوا دیا گیا۔ وہ عمر بھر پاکستان اور اس کے عوام کے لیے اپنے دل میں نیک خواہشات بسائے رہے اور دونوں ملکوں کے درمیان دوستی اور خوشگوار تعلقات کے لیے سر توڑ کوششیں کرتے رہے۔ وہ دہلی کے ایک روزنامے 'حیات' کے مدیر تھے اور ایک صحافی ہونے کی حیثیت سے پچھلے دنوں پاکستان آنے کی اجازت حاصل کرنے کے لیے کوشش کررہے تھے۔ اس ضمن میں انھوں نے آکسفورڈ کے اپنے پرانے ہم سبق اور آج کل لندن میں پاکستان کے سفیر میاں ممتاز دولتانہ سے ملاقات بھی کی تھی اور دولتانہ صاحب نے جناب ذوالفقار علی بھٹو کو اس بارے میں لکھا بھی تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ بھٹو صاحب کا جواب

یہاں سے جاتا سجاد ظہیر اس دنیا سے ہی رخصت ہو گئے۔

سجاد ظہیر کوئی پر نویس قسم کے ادیب نہیں تھے۔ اپنے ۳۵ سالہ ادبی کیریئر میں انھوں نے صرف ایک ناول، چند کہانیاں اور ڈرامے اور جدلی مادیت پر ایک کتابچہ، حافظ شیرازی کی شاعری کا تنقیدی جائزہ، ترقی پسند تحریک کی تاریخ، نظموں کا ایک مجموعہ اور دو درجن سے زائد مضامین لکھے، لیکن جو کچھ بھی انھوں نے لکھا جدید اردو ادب پر اس کے بڑے گہرے اثرات پڑے ہیں۔

انھوں نے اپنا ادبی کیریئر بحیثیت افسانہ نگار کے شروع کیا لیکن جلد ہی وہ تنقید کی طرف نکل آئے اور بلا شبہ ان کے افکار اور خیالات کی ترجمانی کا یہی سب سے اچھا ذریعہ ثابت ہوا۔

اردو تنقید کی تاریخ میں ان کے تنقیدی مضامین سنگ میل کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کے مضامین سے کلاسیکی اور جدید ادب کی تعبیر اور تنقید کے لیے نئی سمتیں کھلی ہیں۔ جو سادگی ان کی شخصیت کا جزو تھی وہی ان کے ادبی اسلوب کی خصوصیت بھی ہے۔ انھوں نے ادب کی سکہ بند ترکیبیں اور بھاری بھرکم الفاظ اپنے پڑھنے والوں کو متاثر اور خوفزدہ کرنے کے لیے کبھی استعمال نہیں کیے۔ وہ کسی سے اپنی ذہنی برتری منوانے کے قائل ہی نہیں تھے۔ وہ دلائل سے آدمی کو قائل ضرور کرتے تھے لیکن انھوں نے کبھی روایتی علمی اکڑفوں نہیں دکھائی۔ بحث و مباحثہ وہ بڑے شان سے کرتے تھے اور اپنی ساری علمی قوت صرف کر دیتے تھے لیکن انھوں نے کبھی کسی کے جذبات کو مجروح نہیں کیا۔ وہ تنقید بہت سخت کرتے تھے لیکن نہ ان کے دل میں کسی کی طرف سے میل ہوتا تھا نہ کبھی نجی حملے کرتے تھے۔ نہ کبھی اپنے مخالف کے بارے میں سرپرستانہ رویہ اختیار کرتے تھے۔

فطرت نے انھیں بڑا میٹھا مزاج دیا تھا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ وہ ہمارے دور کی سب سے زیادہ پسندیدہ اور پیار کی جانے والی شخصیت تھے۔ لوگوں سے ملنے جلنے کا انھیں بے حد

شوق تھا اور خاص طور سے نوجوان لکھنے والوں اور ذکی اور ذہین نوجوانوں سے وہ بڑے خلوص سے ملتے تھے۔ نہ صرف ان کو بڑی کشادہ پیشانی اور خوش دلی کے ساتھ خوش آمدید کہتے تھے بلکہ ان کے مسائل پر بڑی توجہ اور گرم جوشی سے تبادلۂ خیال کرتے تھے، وہ بھی ایک مخلص دوست اور ان کے برابر کے ساتھی کی حیثیت میں، نہ کہ کسی فتوے باز مفتی کی طرح۔ وہ بڑے صبر وسکون کے ساتھ دوسروں کی گفتگو سنتے اور کبھی کسی ملاقاتی کو انھوں نے ہراساں کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا ہر ملاقاتی انھیں بڑے پیار سے بنّے بھائی کہتا تھا۔

سجاد ظہیر کے اندر ادبی تقریبات کی تنظیم اور ترتیب کی بڑی صلاحیتیں تھیں، مثلاً اس صدی کی ربعِ اوّل میں ڈھاکہ سے پشاور اور دہلی سے مدراس تک کا سفر کرنا اور مختلف زبانوں اور نسلی گروہوں سے تعلق رکھنے والے ادیبوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا اور پھر ان کو ایک بڑی تنظیم کی لڑی میں پرودینا بڑا جان جوکھوں کا مرحلہ تھا لیکن سجاد ظہیر نے یہ کام نہایت خوش اسلوبی سے اور ہنستے کھیلتے کر دکھایا۔ اس دوران میں نہ انھوں نے کبھی عجلت پسندی دکھائی اور نہ کبھی کسی پر غصہ کیا اور نہ ہی ان کے چہرے پر کبھی بے زاری، تھکاوٹ اور ناگواری کے اثرات دیکھنے میں آئے۔

سجاد ظہیر ادب اور سیاست دونوں کے بارے میں سخت جانب دار تھے۔ وہ عمر بھر اپنے مقصدِ نظر کے لیے رزم آرا رہے۔ اور اس راہ میں انھوں نے بلاشبہ بہت بڑی قربانیاں دیں۔ لیکن اس سب کچھ کے باوجود انھوں نے اپنے دوستوں اور عزیزوں پر کبھی اپنے نظریات تھوپنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ بڑے روشن دماغ انسان ہونے کے ساتھ ساتھ صحیح معنوں میں صاحبِ ذوق اور جمال پسند انسان تھے اس لیے کہ زندگی کے ہر حسن سے انھیں شدید پیار تھا۔ چاہے وہ کسی روپ میں کیوں نہ ہو اور اسی شدت کے ساتھ وہ لوگوں کی غربت، بدحالی اور ذہن پر پہرے بٹھا دینے سے نفرت کرتے تھے۔ وہ مشرقی اور مغربی موسیقی کے بڑے دلدادہ تھے اور فارسی، اردو اور ہندی شاعری کو بے حد پسند کرتے تھے۔

وہ عمر بھر انسانوں اور انسانیت کی سربلندی کے لیے بڑے خلوص اور چاؤ کے ساتھ جدوجہد کرتے رہے اور کسی موقع پر بھی انھوں نے کسی قسم کی تلخی کا شائبہ تک نہیں آنے دیا۔ اردو ادب کی تاریخ میں ان کا نام ایک ایسی زندگی بخش تحریک کے بانی کی حیثیت سے یاد رکھا جائے گا جس نے ابتدا سے اب تک اعلا تخلیقی صلاحیتوں والی دو نسلوں کو جنم دیا ہے۔

(۲)

حیات اور موت کا رشتہ ابدی ہے۔ اور ہم سب جو زندہ ہیں وہ ہر لحہ موت ہی کی طرف سفر کر رہے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ ہم یہ سفر کیسے کرتے ہیں۔ حیات بخش قوتوں سے رابطہ رکھ کر یا موت کی قوتوں کے سایے میں کیونکہ جینے کے دو ہی طریقے ہیں۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ آدمی جب تک زندہ رہے زمین کا بوجھ بنا رہے اور لوگ اس سے پناہ مانگتے رہیں حتی کہ اس کا جنازہ بھی وبالِ دوش ہو۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ انسان جب تک زندہ رہے دوسروں کی زندگی کا سہارا بنا رہے اور مرتے وقت نہ اپنی ذات سے نادم ہو نہ دنیا والوں سے شرمندہ ہو۔

سجاد ظہیر صاحب جن کا سوگ منانے کے لیے ہم لوگ آج یہاں جمع ہوئے ہیں بڑے آن بان سے جیے اور بڑی شان سے اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ انھوں نے ایک بھرپور زندگی گزاری۔ تمام عمر زندگی، سچائی، انصاف اور انسانیت کی قوتوں کا ساتھ دیا۔ اور بدی، بے انصافی، انسان دشمنی، ذہنی اور مادّی غلامی، غرض یہ کہ ان تمام قوتوں سے لڑتے رہے جو موت اور زوال کی نشانیاں ہیں۔

سجاد ظہیر نیکی اور صداقت تھے اس لیے ان کے ساتھ رفاقت کا رشتہ جوڑنا بہت آسان تھا۔ ان کا دل بقول غالبؔ، مہر وفا کا باب تھا۔ اس دروازے پر نہ کوئی حاجب و دربان تھا اور نہ شناختی کارڈ کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس لیے پاکستان کیا اس شہر میں بھی آپ

کو ایسے لوگوں کی کافی تعداد ملے گی جو اُن کی شرافت، خلوص، انسان دوستی کے معترف ہوں گے۔ یہاں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جنھوں نے ان کے ساتھ مل کر ادبی یا سیاسی کام کیا ہے۔ اگر میں کچھ ایسی باتیں کہوں جس میں خود نمائی کی جھلک نظر آئے تو آپ لوگ مجھے معاف کر دیں کیونکہ ان کی ذات سے وابستگی میں عام طور سے من وتو کے حجابات اٹھ جاتے تھے اور ہر شخص یہی محسوس کرتا تھا کہ میری ذات سجاد ظہیر کی ذات کا ایک جزو ہے۔

سجاد ظہیر کی ادبی زندگی کے بارے میں بہت کچھ کہا اور لکھا جاچکا ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ترقی پسند ادب کی تحریک کی بنیاد ڈالنے اور اس تحریک کو آگے بڑھانے میں انھوں نے بڑا تاریخی کردار ادا کیا ہے۔ ان کی تحریروں نے ادیبوں کے طرز فکر واحساس پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ چنانچہ ان کی ادبی خدمات کبھی بھلائی نہیں جاسکتیں۔ لیکن ان کی شخصیت کا سیاسی پہلو ابھی زیادہ اجاگر نہیں ہوا ہے۔ وہ طالب علمی کے زمانے میں کمیونسٹ تحریک سے وابستہ ہوئے اور مرتے دم تک اس سے وابستہ رہے وہ ایک نہایت خوش حال گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور اپنی اعلیٰ تعلیم کے باعث بڑی آسانی سے نہایت آسودہ اور پرحشم زندگی بسر کرسکتے تھے۔ لیکن انھوں نے انقلابی جدوجہد کی پرخار وادی میں قدم جان بوجھ کر اور سوچ سمجھ کر رکھا تھا۔ انھوں نے کبھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھا کہ اس آبلہ پائی نے کتنے کانٹوں کو گلنار بنایا ہے۔ وہ آگے ہی بڑھتے رہے۔

جو لوگ سجاد ظہیر کے مزاج کی نرمی، مٹھاس اور نفاست سے واقف تھے اور فنون لطیفہ سے ان کی والہانہ محبت سے آگاہ تھے، ان کو سجاد ظہیر کی سیاسی مصروفیتوں پر کبھی کبھی بڑی حیرت ہوتی تھی۔ کیونکہ کمیونسٹ پارٹی کی سرگرمیوں میں حصہ لینا یا پارٹی کی تنظیم کے لیے دوڑ بھاگ کرنا بظاہر بڑا غیر شاعرانہ فعل معلوم ہوتا ہے۔ وہ سوچتے تھے کہ اتنا نازک مزاج شخص بھلا مزدوروں اور کسانوں میں گھل مل کر کس طرح کام کرسکتا ہے۔ ادب اور پارٹی کی سیاست ان کو دو متضاد چیزیں نظر آتی تھیں مگر سجاد ظہیر کو اس بات پر حیرت ہوتی تھی کہ وہ

لوگ جو اپنے کو روشن خیال اور ترقی پسند کہتے ہیں کمیونسٹ کیوں نہیں ہو جاتے۔ وہ کہتے تھے کہ میں ترقی پسند ادیب اسی لیے ہوں کہ کمیونسٹ ہوں اور کمیونسٹ اسی لیے ہوں کہ ترقی پسند ادیب ہوں۔ وہ ان دونوں حقیقتوں کو ایک دوسرے کی ضد نہیں سمجھتے تھے بلکہ ایک کو دوسرے کا منطقی نتیجہ تصور کرتے تھے۔

انھوں نے پاکستان کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکریٹری کا عہدہ بڑے پریشان کن حالات میں سنبھالا تھا۔ پاکستان میں کمیونسٹ پارٹی کے صوبائی دفتر لاہور، کراچی اور پشاور میں موجود تھے۔ لیکن سب سے فعال صوبائی پارٹی صوبہ پنجاب کی تھی۔ البتہ اس پارٹی کے بیشتر رہنما سکھ یا ہندو تھے۔ سردار سوہن سنگھ جوش، سردار تیجا سنگھ سوتنتر، سردار کرم سنگھ مان وغیرہ۔ ان میں سے بعض کا تعلق غدر پارٹی سے رہ چکا تھا۔ بعض مولانا عبید اللہ سندھی اور مولوی برکت اللہ مرحوم کے ساتھ کام کر چکے تھے اور دس دس پندرہ پندرہ سال قید رہے تھے۔ ملک تقسیم ہوا تو ان سب لوگوں کو بھی ہندوستان جانا پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں کی پارٹی کا شیرازہ بکھر گیا۔ سجاد ظہیر کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے تین سال کی مختصر مدت میں کمیونسٹ پارٹی کے نہ صرف بکھرے ہوئے تاروں کو از سر نو جوڑا بلکہ نئے کارکنوں کی سیاسی تربیت کرکے اس نوزائیدہ پارٹی کو ایک نہایت باعمل اور منظم جماعت میں تبدیل کر دیا۔ سجاد ظہیر کو پاکستان کے حالات کا مطالعہ کرنے کا بہت کم موقع ملا تھا۔ روپوشی کی وجہ سے وہ عام لوگوں سے کیا خود پارٹی کے کارکنوں اور ہمدردوں سے بھی آزادی سے نہ مل سکتے تھے۔ اس کے باوصف ان کی شخصیت میں اس بلا کی کشش تھی کہ پارٹی کا ہر رکن ان سے ذاتی طور پر ایک یگانگت اور اپنایت محسوس کرتا تھا۔ ہر شخص کو ان پر اور اُن کے طریقۂ کار پر پورا پورا بھروسا تھا۔ یہی وہ اوصاف تھے جن کی بدولت وہ پارٹی کے اندر فکر و عمل کی وحدت کو فروغ دینے میں کامیاب ہوئے۔ اس وقت کمیونسٹ پارٹی سیسہ کی ایک دیوار تھی جس میں گروہ بندیوں اور باہمی رقابتوں کے شگاف نہیں تھے۔

سجاد ظہیر بنیادی طور پر ایک آرٹسٹ تھے۔ چنانچہ وہ انقلابی سرگرمیوں کو بھی ایک آرٹسٹ کی نظر سے دیکھتے اور برتتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ انقلاب بھی تو سازِ ہستی کا ایک حیات بخش نغمہ ہے لہٰذا ہر انقلابی کارکن کا فرض ہے کہ جس طرح ایک موسیقار ستار کے مختلف تاروں کو حرکت دے کر ان کی آوازوں میں ایک آہنگ اور حسن پیدا کرتا ہے یا ایک پیانو بجانے والا پیانو کی پتیوں پر اپنی انگلیوں کی جنبش سے نئی نئی دھنیں بناتا ہے تاکہ لوگوں کا جمالیاتی ذوق نکھرے اور ان میں زندہ رہنے اور زندگی کو حسین بنانے کا ولولہ پیدا ہو اسی طرح ہم انقلابیوں کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ اپنے عمل سے لوگوں میں زندگی سے محبت کرنے، زندگی کے سچے اور حیات بخش اقدار کو ترقی دینے، زندگی کو زیادہ آسودہ، آزاد اور باشعور بنانے اور ان قوتوں سے نبردآزما ہونے کی صلاحیتیں ابھاریں جو انسانیت کے لیے ایک جان لیوا روگ بن گئی ہیں۔

سجاد ظہیر نے تحریکِ پاکستان کی حمایت اس وقت کی جب مسلم لیگ ایک جماعت تھی اور برصغیر کی تمام سیاسی جماعتیں تحریک پاکستان کے خلاف تھیں انھوں نے قوموں کے حقِ خودارادیت کی تشریح میں جو مضامین لکھے یا تقریریں کیں ان کی بدولت بہت سے مسلم لیگی رہنماؤں کو پہلی بار قوموں کے حق خودارادیت کا علم ہوا۔ لیکن کتنی عجیب بات ہے کہ پاکستان کے اربابِ اختیار نے اسی شخص کو قابلِ گردن زدنی ٹھہرایا۔

چنانچہ ان کے پاکستان میں قدم رکھنے سے پیشتر ہی ان کی گرفتاری کا پروانہ جاری ہوگیا تھا۔ وہ جب تک پاکستان میں رہے روپوش رہے۔ یا پھر گرفتار اور جب وہ رہا ہوئے تو انھیں دو دن کے اندر ملک بدر کردیا گیا۔ اس نیک سلوک کے باوجود سجاد ظہیر جب تک زندہ رہے پاکستان اور یہاں کے لوگوں سے محبت کرتے رہے۔ ان کی برابر یہ کوشش رہی کہ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان دوستی اور محبت کے رشتے قائم ہوجائیں۔ اپنے مضامین میں اور تقریروں میں وہ ہمیشہ اسی بات پر زور دیتے تھے۔ حال ہی میں انھوں نے نئی دہلی کے

ایک ہفتہ وار اخبار میں پاکستانی ادب پر بڑی ہمدردی سے ایک مضمون لکھا تھا۔ اس کا حوالہ دیتے ہوئے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ: 'پاکستانی ادب پر ایک چھوٹا سا مضمون میں نے حال ہی میں ایک ہندوستانی ہفتہ وار کے لیے لکھا تھا۔ ہندوستان میں پاکستانی کتابیں بڑی مشکل سے یا بالکل نہیں ملتیں۔ پاکستان کے پرانے رسالوں کے بل پر اور پرانی کتابوں کی بنیاد پر جو کچھ ہوسکا میں نے وہ لکھا۔ پھر بھی ہندوستان کے موجودہ حالات میں شاید یہ بھی غنیمت تھا۔' ایک اور خط میں لکھتے ہیں کہ: 'یہ کیسی غیر فطری صورتِ حال ہے کہ دوست عزیز تک ایک دوسرے سے نہیں مل سکتے اور نہ ایک ملک سے دوسرے ملک آ جا سکتے ہیں۔ دہلی سے ماسکو یا لندن جانا آسان ہے، امرتسر سے لاہور ناممکن ہے۔ یورپ والے آپس میں بڑی بڑی خوفناک لڑائیاں لڑتے رہے ہیں۔ فرانس اور جرمنی تو شارلیمین کے زمانے سے یعنی ہزار سال سے ہر صدی میں دو چار لڑائیاں لڑ لیتے ہیں۔ لیکن لڑائی بند ہوئی اور آنا جانا، تجارت، لین دین سب شروع ہوجاتا ہے۔ لیکن ہماری دشمنیاں اتنی مجنونانہ ہیں کہ اپنا بھلا اور انسانیت کا بھلا دونوں بھول جاتے ہیں۔ آج اسلام آباد میں گفتگو ہو رہی ہے میرا خیال ہے کہ اس بار کوئی مثبت نتیجہ ضرور نکلے گا۔ لیکن کتنا مثبت کہ ہر مرتبہ جب ملتے ہیں تو گاڑی آگے بڑھتی ہے لیکن کچھ دور چل کر پھر دلدل میں پھنس جاتی ہے۔ میاں دعا کرو کہ ہماری تمہاری زندگی میں کم از کم یہ صورت تو ختم ہو۔' (۲۴ر جولائی، ۷۳ء، لندن)

افسوس ہے کہ ان کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔ انھوں نے لندن میں میاں ممتاز دولتانہ سے ملاقات کی تھی تاکہ وہ سجاد ظہیر کو اخبار نویس کی حیثیت سے پاکستان آنے کی اجازت دلوا دیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہاں سے واپس جانے کے بعد وہ جو مضامین لکھتے ان کا اثر ان ہندوستانی اخبار نویسوں کی تحریروں سے زیادہ ہوتا جو اَب تک یہاں آ چکے ہیں۔

سجاد ظہیر تمام عمر اس راہ پر چلتے رہے جو انسانی معاشرے کے نجات کی راہ ہے۔ شعورِ ذات، تحصیلِ ذات اور تکمیلِ ذات کا راستہ بھی یہی ہے۔ سجاد ظہیر اب زندہ نہیں ہیں لیکن ان

کے کارنامے تو زندہ اور تابندہ ہیں۔ اب یہ نوجوانوں کا کام ہے کہ اس روشنی سے کسب فیض کریں اور آزادی اور جمہوریت کا جو پیغام سجاد ظہیر لے کر چلے تھے اس کو اپنے ہم وطنوں تک پہنچائیں۔

ہر لحظہ نیا طور، نئی برقِ تجلی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

'روشنائی' — اک تعارف

یہ مضمون سجاد ظہیر کی کتاب ''روشنائی'' میں دیباچے کے طور پر شامل ہے

سید سجاد ظہیر مرحوم انجمن ترقی پسند مصنفین کے بانیوں میں سے تھے۔ وہ جب تک زندہ رہے ترقی پسند ادب کی تحریک کو آگے بڑھانے کی برابر کوشش کرتے رہے۔ اس ادبی تنظیم کا منصوبہ ۱۹۳۵ء میں لندن میں بنا تھا اور ایک مختصر سا منشور بھی تیار ہوا تھا جس کی نقلیں برصغیر کے بعض ادیبوں کو بھیج دی گئی تھیں۔ لیکن انجمن کی تنظیم کا کام سجاد ظہیر کے وطن واپس آنے ہی پر شروع ہوا۔ منشور کی وضاحت کرنے اور ادیبوں کو انجمن میں شرکت کی دعوت دینے کی غرض سے سجاد ظہیر نے قریب قریب سبھی بڑے ادبی مرکزوں کا دورہ کیا۔ وہ علامہ اقبال، رابندر ناتھ ٹیگور، منشی پریم چند، مولوی عبدالحق، مولانا حسرت موہانی، میاں بشیر احمد، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، مولانا عبدالمجید سالک، مولانا غلام رسول مہر، اختر شیرانی اور دوسرے متعدد پرانے اور نئے ادیبوں سے ملے۔ بیشتر ادیبوں نے انجمن کے اغراض و مقاصد سے اتفاق کیا۔ اس لیے کہ منشور میں ایسی کوئی بات نہ تھی جس سے کسی روشن خیال اور حریت پسند صاحب قلم کو اختلاف ہوتا۔ انجمن کا پہلا جلسہ منشی پریم چند کی صدارت میں ہوا تھا۔ اور وہیں سجاد ظہیر جنرل سیکریٹری چنے گئے تھے۔

انجمن ترقی پسند مصنفین ہندوستان میں تو آج بھی موجود ہے البتہ پاکستان میں اس خالص ادبی جماعت کو ۱۹۵۴ء میں خلافِ قانون جماعت قرار دے دیا گیا۔ حالانکہ انجمن کے جنرل سیکریٹری جناب احمد ندیم قاسمی تھے اور ملک کے اکثر ممتاز ادیب اس انجمن سے وابستہ تھے۔ یہاں تک کہ ایک ہی سال قبل انجمن کی سالانہ کانفرنس کی صدارت ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے کی تھی۔

سجاد ظہیر نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے بی اے پاس کیا اور بیرسٹری کی سند بھی لی۔ شاید ان کے والد سر سید وزیر حسن چیف جج لکھنؤ چیف کورٹ کی خواہش یہی تھی کہ بیٹا وکالت میں نام پیدا کرے لیکن سجاد ظہیر کو وکالت سے کوئی دلچسپی نہ تھی بلکہ ان کا طبعی میلان ادب کی طرف تھا۔ وہ لندن میں تعلیم کے دوران ہی میں کمیونسٹ ہو گئے تھے اور آخر دم تک کمیونسٹ تحریک سے وابستہ رہے۔ وکالت انھوں نے کبھی نہیں کی۔

سجاد ظہیر نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نویسی سے کیا تھا۔ اُن کے دو افسانے 'انگارے' میں بھی شائع ہوئے تھے۔ افسانوں کا یہ وہی مجموعہ ہے جس نے ۳۴-۱۹۳۳ء میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ انگارے میں سجاد ظہیر کے علاوہ پروفیسر احمد علی، ڈاکٹر رشید جہاں اور محمود الظفر کی کہانیاں بی شامل تھیں۔ اس کے بعد سجاد ظہیر نے 'لندن کی ایک رات' لکھی۔ یہ ناول برطانیہ میں تعلیم پانے والے ہندوستانی نوجوانوں کی نفسیاتی الجھنوں کی بہت کامیاب ترجمانی کرتا ہے اور اردو میں 'شعور کے تموّجات' (Streams of Consciousness) کا غالباً پہلا تجربہ ہے۔ وطن واپس آنے کے بعد انھوں نے ایک ڈرامہ 'بیمار' اور متعدد ادبی مضامین لکھے جو ترقی پسند اصول تنقید کا بہت اچھا نمونہ ہیں۔

۱۹۳۹ء میں جب سامراجی جنگ چھڑی اور وطن پرستوں کی پکڑ دھکڑ شروع ہوئی تو سجاد ظہیر بھی گرفتار کر لیے گئے، (اسیری کے ایام میں انھوں نے جو خط اپنی بیوی رضیہ کو لکھے تھے وہ 'خطوطِ زنداں' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں)۔ پھر ۱۹۴۱ء کے وسط میں رہا ہوئے

اور کمیونسٹ پارٹی کے ہفت روزہ اخبار 'قومی جنگ' کے اڈیٹر ہوکر بمبئی چلے گئے مگر انجمن ترقی پسند مصنفین سے ان کی وابستگی میں کوئی فرق نہ آیا بلکہ ان کا فلیٹ جلد ہی ادیبوں کی بیٹھک بن گیا۔ وہاں ہر ہفتے انجمن کا جلسہ ہوتا تھا اور نئی ادبی تخلیقات پڑھی جاتی تھیں یا ادبی مسائل پر گفتگو ہوتی تھی۔

اگست ۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان اور پاکستان دو آزاد ملکوں کی حیثیت سے وجود میں آئے تو ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی بھی دو حصوں میں بٹ گئی اور سجاد ظہیر پاکستان کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری چنے گئے۔ اب ان کا تعلق ترقی پسند مصنفین کی تنظیم سے نہ رہا مگر وہ ادبی مضامین بدستور لکھتے رہے۔ اپریل ۱۹۵۱ء میں ان کو راولپنڈی سازش کیس کے سلسلے میں گرفتار کرلیا گیا۔ وہ چار سال جیل میں رہے اور ۱۹۵۵ء میں لاہور ہائی کورٹ کے فیصلے کے مطابق مچھ جیل سے رہا ہوئے۔ ان کی بیوی بچے ہندوستان میں تھے لہذا وہ دہلی چلے گئے۔ ستمبر ۱۹۷۳ء میں وہ ایک بین الاقوامی ادبی کانفرنس میں شرکت کرنے جمہوریہ قازقستان کے دارالحکومت الما آتا گئے ہوئے تھے کہ اُن پر اچانک دل کا دورہ پڑا اور وہ انتقال کر گئے۔

ترقی پسند ادب کی تخلیق کسی عہد، کسی قوم، کسی زبان کا اجارہ نہیں ہے۔ بلکہ ادیبوں نے ہر دور میں معاشرے کے صحت مند رجحانات کی پذیرائی اور ظلم و جبر کی قوتوں کی مذمت کی ہے۔ ترقی پسندی سے مراد معاشرے کی تخلیقی صلاحیتوں کو صیقل کرنا، حیات آفرین عناصر کا ساتھ دینا اور مرگ آفریں قوتوں سے نبرد آزما ہونا ہے۔ لہذا وہ 'وحشی' قبیلے بھی ترقی پسند تھے جنہوں نے سب سے پہلے انسانی توانائی میں اضافے کی خاطر تیر کمان، بلم، بھالے بنائے، آگ کا استعمال دریافت کیا مویشی پالے، کھیتی باڑی شروع کی یا چاک پر مٹی کے برتن بنائے۔ اور وہ پرانے مفکر بھی ترقی پسند تھے جنہوں نے 'آتش و آب و خاک و باد' کے حوالے سے کائنات کی مادّی تشریح کی یا یہ کہہ کر کہ 'انسان ہی تمام چیزوں کا پیمانہ ہے'، بشر کو

عظمتِ بشر کا احساس دلایا۔ اور وہ لوک شاعر اور گویے بھی ترقی پسند تھے جنھوں نے اپنے گیتوں، گانوں سے چند لمحوں ہی کے لیے سہی لوگوں کو خوش کیا اور ان میں جینے کا عزم، ہمت نہ ہارنے کا حوصلہ اور سچ کے لیے جان دینے کی جرأت پیدا کی۔

ترقی پسندی کا تعین زندگی میں ہو یا ادب میں ہو معاشرہ اپنے سماجی شعور اور وقت کے تقاضوں کے مطابق کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معاشرے میں تبدیلی کے ساتھ ترقی پسندی کے مفہوم میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ادب بھی چونکہ انسان ہی کے تخیل اور جذبے کی پیداوار ہے لہٰذا ادب کی قدریں اور جہتیں بھی بدلتی رہتی ہیں۔ چنانچہ مولانا حالی 'مقدمہ شعر وشاعری' میں لکھتے ہیں کہ:

> 'قاعدہ ہے کہ جس قدر سوسائٹی کے خیالات، اس کی رائیں، اس کی عادتیں، اس کی رغبتیں، اس کا میلان اور مذاق بدلتا ہے اسی قدر شعر کی حالت بھی بدلتی رہتی ہے اور یہ تبدیلی بالکل بے معلوم ہوتی ہے کیونکہ سوسائٹی کی حالت کو دیکھ کر شاعر قصداً اپنا رنگ نہیں بدلتا بلکہ سوسائٹی کے ساتھ ساتھ وہ خود بہ خود بدلتا چلا جاتا ہے۔'

یہ ایسا کلیہ ہے جو ہر زبان اور ہر زمانے کے ادب پر صادق آتا ہے۔

ترقی پسند ادب کی تحریک کوئی اتفاقی حادثہ نہ تھی اور نہ کسی کی سازش تھی بلکہ پہلی جنگِ عظیم کے بعد دنیا میں جو حالات پیدا ہوئے اُن کا قدرتی نتیجہ تھی۔ اس جنگ میں ڈیڑھ کروڑ جوان مارے گئے، ڈھائی کروڑ زخمی اور لاپتہ ہوئے، اربوں روپے کا سامان جو لوگوں کو سکھ چین دے سکتا تھا جل کر راکھ ہوگیا۔ البتہ فائدہ کس کو ہوا؟ پونجی پتیوں کو، بینکروں، ساہوکاروں اور مل مالکوں کو۔ موت کے اس خونی رقص کو رُکے ہوئے ابھی تھوڑے ہی دن گزرے تھے اور بربادی کے ملبے ابھی صاف بھی نہ ہوئے تھے کہ اقتصادی بحران کا بھوت سروں پر منڈلانے لگا۔ اس بحران کی ابتدا امریکہ میں ہوئی تھی مگر دیکھتے ہی دیکھتے ہر ملک

اس آگ کی لپیٹ میں آ گیا۔ لاکھوں کروڑوں تندرست انسان بے روزگار ہوکر دربدر کی خاک چھاننے لگے۔ نیویارک جیسے شہر میں لوگ فاقے سے مرنے لگے۔ روٹی روزگار مانگنے والوں کے نہتے جلوس پر گولیاں چلنے لگیں اور لوگ قید خانے کو آزادی پر ترجیح دینے پر مجبور ہوئے کہ وہاں دو وقت کھانا تو ملتا تھا۔ بے چینی کی ایک طوفانی لہر تھی جو زمین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل گئی۔ اسی اثنا میں فاشزم نے جاپان اور یورپ میں سر اٹھایا۔ پھر تو یکے بعد دیگرے ایسے واقعات پیش آئے کہ انسانیت کا مستقبل ہی تاریک نظر آنے لگا۔ چین پر جاپان کا حملہ، جرمنی میں آزادی اور جمہوریت کا خاتمہ، تھامس مان، ارنسٹ ٹولر، سٹیفان زوائگ، برتوار بریخت، فرائڈ، آئن سٹائن اور دوسرے ادیبوں، سائنس دانوں اور مفکروں کی جلا وطنی، اُن کی کتابوں کا سرِ عام جلا دیا جانا، مسولینی کا حبشہ پر حملہ، اسپین میں منتخب شدہ جمہوری حکومت کے خلاف جنرل فرانکو کی بغاوت اور لورکا کا قتل ایسے سانحے تھے جن کے عواقب ونتائج کا اندازہ لگانا عام آدمی کے لئے بھی چنداں مشکل نہ تھا چہ جائیکہ ادیبوں اور دانش وروں کے لیے۔

ادیبوں نے عالمگیر اقتصادی بحران اور بین الاقوامی حالات کے ملے جلے اثرات کو بڑی شدت سے محسوس کیا۔ چنانچہ یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ جس اعلیٰ معیار کا احتجاجی ادب بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں تخلیق ہوا اس کی نظیر مشکل سے ملے گی۔ ایسے کٹھن وقت میں جبکہ ہر طرف ہاہا کار مچی ہوئی تھی اور سرمایہ داروں کی ہوسناکیاں بھوکے بے سہارا انسانوں کے ضمیر کا سودا کرنے پر تلی ہوئی تھیں ترقی پسند ادیب ہی تھے جنہوں نے دکھی انسانیت کے غموں کو اپنایا۔ اُن میں جہد وکسب کی روح پھونکی، اُن میں زندگی کا اعتماد پیدا کیا اور دشمنوں کی انسانیت سوز حرکتوں کو بے نقاب کیا۔ جن لوگوں نے سینکر لوئس، جان اسٹائن بیک، تھامس مان، ہنری مان، ارنسٹ ہمنگوے، جان ڈاس پاسوس، آڈین، سپنڈر، اشرووڈ، لوئی میکنس، شیرووڈ اینڈرسن، تھیوڈور ڈرائزر، کلی فورڈ اڈیٹ، آندرے مالرو اور دوسرے

ادیبوں کی تحریریں پڑھی ہیں یا اس دور کی فلمیں دیکھی ہیں ان کو اندازہ ہوگا کہ ان فن کاروں نے معاشرتی زبوں حالیوں کے حسی تجربوں کو کتنے درد اور خلوص سے قلم بند کیا تھا۔ ان میں کئی ایسے ہیں جن کو فنی محاسن کے بدولت ادب کا نوبل انعام بھی ملا۔ جب ادیبوں نے یہ سوال اٹھایا کہ 'تم کس کے ساتھ ہو' تو فقط دو بڑے ادیبوں نے ظلم کی قوتوں کا ساتھ دیا۔ ایک ایزرا پاؤنڈ اور دوسرے ٹی ایس ایلیٹ اور یہی وہ ادیب ہیں جن کو دورِ حاضر کے ادیبوں کا ایک حلقہ بانس پر چڑھائے ہوئے ہے۔ ایزرا پاؤنڈ کھلم کھلا فاشزم کی تبلیغ کرتا تھا۔ وہ مسولینی کا بڑا مداح تھا چنانچہ جب مسولینی نے حبشہ پر حملہ کیا تو اس نے لکھا کہ:

> 'میں، اپنے اس راسخ ایمان کا ایک بار پھر اعلان کرتا ہوں کہ مسولینی استبداد اور اقتدار پرستوں کی صف میں نہیں کھڑا ہوگا بلکہ نظم و قانون کے حامیوں کی صف میں۔'

ایزرا پاؤنڈ دوسری جنگ عظیم سے پہلے ہی اٹلی چلا گیا اور روم سے فاشزم کے حق میں تقریریں نشر کرتا رہا۔

ہمارے ملک میں ترقی پسند ادب کی تحریک اُس ادبی تحریک کی ترقی یافتہ شکل ہے جس کی ابتدا انگریزوں کے غلبے کے بعد ہوئی۔ دوسری زبانوں کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا البتہ اردو میں اس نئی تحریک کی طرح سرسید اور اُن کے رفقاء نے ڈالی تھی۔ غالبؔ جو کلاسیکی دور کا آخری اور عہد جدید کا پہلا مفکر شاعر ہے اس تحریک کا پیش رو تھا۔ چنانچہ سرسید کو غالبؔ ہی نے نصیحت کی تھی کہ میاں ماضی کی ہڈیوں کے ہار کب تک گوندھتے رہو گے ذرا گرد و پیش پر نظر ڈالو اور مستقبل میں ملک کا جو نقشہ بننے والا ہے اس پر غور کرو۔ مردہ پروردن مبارک کار نیست۔ آئین اکبری کی تدوین کے وقت تو سرسید کو غالبؔ کی یہ تنقید بری لگی تھی لیکن ۱۸۵۷ء میں جو حالات رونما ہوئے ان کے باعث سرسید کے طرز فکر و احساس میں بڑا نمایاں فرق آیا۔ سائنٹفک سوسائٹی اور علیگڑھ کالج کا قیام اور تہذیب الاخلاق کا اجرا اس نئی

سوچ کی مختلف کڑیاں تھیں۔ سرسید اور ان کے رفقا کی تحریروں نے اردو داں طبقے کو زندگی کے بارے میں نئے انداز سے سوچنے پر مجبور کردیا۔

سرسید نے اس وقت کے اردو ادب پر تنقید کرتے ہوئے بڑے پتے کی بات کہی کہ:

'زمانہ اور زمانے کی طبیعت اور علوم اور علوم کے نتائج سب تبدیل ہوگئے ہیں۔ ہمارے یہاں کی قدیم کتابیں اور ان کا طرز بیان اور ان کے الفاظ مستعملہ ہم کو آزادی اور راستی اور صفائی اور سادہ پن اور بے تکلفی اور بات کی اصلیت تک پہنچانا ذرا بھی تسلیم نہیں کرتے۔ بلکہ برخلاف اس کے دھوکے میں پڑنا اور پیچیدہ بات کہنا اور ہر بات کو لون مرچ لگادینا اور ہر امر کی نسبت غلط اور خلافِ واقع الفاظ شامل کردینا اور جھوٹی تعریف کرنا اور زندگی کو غلامی کی حالت میں رکھنا۔ یہ تمام باتیں حال کے زمانے اور حال کے زمانے کی طبیعت کے مناسب نہیں۔' (تہذیب الاخلاق، جلد ۳ صفحہ ۱۷۴)

سرسید اور ان کے عہد کے دوسرے ادیبوں مثلاً آزادؔ، حالیؔ، اسماعیل میرٹھی وغیرہ کا ادبی کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو ادب کو افسردگی اور مایوسی اور فرار اور فرضی باتوں کے اثر سے نکالنے کی کوشش کی اور حقیقت بنی اور امید اور رجائیت کی طرف مائل کیا۔

اس ضمن میں انجمن پنجاب کی خدمات کبھی فراموش نہیں کی جاسکتیں۔ دراصل ادیبوں کی یہ پہلی باقاعدہ تنظیم تھی جس نے روایتی طرز احساس اور طرز بیان دونوں کو شعوری طور پر رد کیا اور ادب کو زندگی کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ یہ انجمن ۱۸۷۳ء میں مولوی محمد حسین آزاد اور مولانا حالیؔ کی کوششوں سے بنی تھی۔ آزادؔ کے لیکچروں اور حالی کے 'مقدمہ شعر و شاعری' کو اس تحریک کا منشور کہا جاسکتا ہے۔

مگر یہ 'اصلاحی ادب' بیسوی صدی کی تیز رفتاری کا ساتھ نہ دے سکا۔ جنگِ بلقان و

طرابلس، تحریک خلافت، جلیان والا باغ کا قتل عام، قصہ خوانی بازار کا سانحہ اور پھر سول نافرمانی کے ہنگامہ دارو گیر میں اصلاحی ادب کی آواز کون سنتا۔ اب تو نئے ادیبوں کے تیور ہی بدلے ہوئے تھے۔ یہ احساس کہ بندگی میں زندگی گھٹ کر جوئے کم آب رہ جاتی ہے اور آزادی میں بحر بیکراں بن جاتی ہے، یہ احساس کہ ہم آزاد نہیں ہیں، یہ احساس کہ ہمیں آزاد ہونا چاہیے اور یہ سوز یقین کہ ہم آزاد ہوں گے، اسی دور میں پوری شدت سے ابھرا۔ چنانچہ علامہ اقبالؔ، مولانا ابوالکلام آزادؔ، مولانا حسرتؔ موہانی، مولانا ظفر علی خان، قاضی عبدالغفار، منشی پریم چند، جوشؔ ملیح آبادی، اور اس دور کے دوسرے ادیب حریت کے نقیب بن کر آئے اور اس طرح ہمارے ملک میں احتجاجی ادب کی داغ بیل پڑی اور ادیب بیسوی صدی کے قومی اور بین الاقوامی مسائل اور سماجی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں لکھنے لگے۔

ترقی پسند ادب کی تحریک ان ہی درخشاں روایتوں کو لے کر آگے بڑھی تھی۔ وہ بدیسی پودا نہ تھی جو اجنبی زمین میں لگایا گیا ہو بلکہ اس کی آبیاری یہیں کے پانی سے ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب سجاد ظہیر اور اُن کے رفقا نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھی تو پرانے اور نئے ہر مکتبۂ فکر کے حریت پسند ادیبوں نے انجمن کا خیر مقدم کیا۔ ان میں کمیونسٹ اور سوشلسٹ بھی تھے اور نیشنلسٹ بھی۔ مخالفت اگر ہوئی تو انگریزی حکومت یا اُس کے مفاد سے وابستہ حلقوں کی طرف سے۔

انجمن ترقی پسند مصنفین میں اردو کے علاوہ بنگلہ، ہندی، مرہٹی، گجراتی، تلگو، تامل، ملیالم، سندھی، پنجابی، پشتو، سبھی زبانوں کے ادیب شامل تھے۔ اُن کے درمیان لسانی یا مذہبی اختلاف کا نام و نشان تک نہ تھا۔ انجمن کی شاخیں قریب قریب ہر بڑے شہر میں قائم تھیں اور وہاں پر ادیبوں کی باقاعدہ بیٹھکیں ہوتی تھیں اور کئی ادبی رسالے تھے جو ترقی پسند ادب کی تحریک کی حمایت کرتے تھے۔

سجاد ظہیر نے مچھ جیل میں دو کتابیں لکھی تھیں۔ 'روشنائی' اور 'ذکر حافظ'، جیل ہی میں

انھوں نے شاعری شروع کی۔ ابتدا میں تو وہ روایتی بحروں میں لکھتے رہے مگر پھر آزاد اور نثری نظمیں کہنے لگے۔ اُن کی نظموں کا ایک مجموعہ 'پگھلا نیلم' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

'روشنائی' ترقی پسند ادب کا ایک تاثراتی جائزہ ہے۔ ہر چند کہ یہ کتاب قریب قریب حافظے سے لکھی گئی ہے کیونکہ سجاد ظہیر کو جیل میں انجمن کی دستاویزیں میسر نہیں تھیں اور نہ حوالے کی کتابیں آسانی سے ملتی تھیں، اس کے باوصف انھوں نے ترقی پسند ادب کی تحریک کی عہد بہ عہد ترقی کو بڑی دیانتداری سے قلم بند کیا ہے اور اُن اعتراضات کا بھی بڑی خوش اسلوبی سے جواب دیا ہے جو مخالف حلقوں کی طرف سے کیے جاتے تھے۔ واقعات کی کڑیاں ایک دوسرے سے ملتی چلی جاتی ہیں اور ان ادبی شخصیتوں کے خاکے بھی اُبھرتے آتے ہیں جن کی تخلیقی سرگرمیوں سے اس تحریک میں جان پڑی تھی۔ سجاد ظہیر شخصیت شناس ہونے کے علاوہ بڑے کامیاب شخصیت نگار بھی تھے۔ انھوں نے اپنے ہم عصر ادیبوں کی تصویریں بڑے پیار سے کھینچی ہیں مگر سچ بات کہنے سے کہیں گریز نہیں کیا ہے۔ البتہ اس پیرائے میں کہ کسی کی دل آزاری نہ ہو۔

سجاد ظہیر کی تحریروں میں وہی نرمی، مٹھاس اور دل کشی ہے جو اُن کی شخصیت کی امتیازی خصوصیت تھی اور جس کی وجہ سے لوگ اُن کے گرویدہ ہو جاتے تھے۔ وہ پُرشکوہ الفاظ اور نامانوس اصطلاحیں استعمال کر کے پڑھنے والوں پر اپنی علمیت کا رعب نہیں بٹھاتے اور نہ خشمگیں لہجے میں وعظ سناتے ہیں بلکہ اُن کی تحریریں پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ کوئی زندہ دل شخص بے تکلف دوستوں کی محفل میں بیٹھا ہنس ہنس کر باتیں کر رہا ہے، وہ اپنے اصولوں سے نہیں ہٹتے بلکہ ان کا اظہار برملا کرتے ہیں مگر وہ اُن کٹر پنتھیوں میں نہیں ہیں جو اپنے سوا ہر شخص کو گمراہ سمجھتے ہیں۔

ترقی پسند ادب کی تحریک ۱۹۴۷ء کے بعد جس نشیب و فراز سے گزری اس کی تاریخ افسوس ہے کہ اب تک نہیں لکھی گئی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے ترقی پسند نقاد اس کمی کو جلد

پورا کریں گے۔ یہ درست ہے کہ ترقی پسند ادیبوں کی فی الحال کوئی ملک گیر تنظیم موجود نہیں ہے لیکن ترقی پسند ادب کی تحریک کبھی مر نہیں سکتی۔ شمعیں جلتی بجھتی رہتی ہیں مگر زندگی کی انجمن سلامت رہتی ہے۔ سجاد ظہیر نے ٹھیک کہا تھا کہ 'ایسی تحریک جسے آگ سے حرارت ملتی ہے اور جو جمہور کے سینے میں دہک رہی ہے نہ دبائی اور نہ ختم کی جاسکتی ہے۔ اس کا مستقبل اس کے ماضی اور حال سے زیادہ روشن ہوگا۔'

سبط حسن

کراچی یکم جولائی ۷۶ء

'روشنائی' — ایک مختصر تبصرہ

سید سجاد ظہیر کی تصنیف 'روشنائی' پر سبطِ حسن صاحب کا ایک تفصیلی مضمون تو 'روشنائی' کے ۱۹۷۶ء کے ایڈیشن مطبوعہ مکتبۂ دانیال، کراچی، میں شامل ہے۔ مکتبۂ دانیال کے بعد کے ایڈیشنوں میں بھی یہ تعارف شامل رہا ہے۔ موجودہ کتاب میں بھی اس کو شامل کرلیا گیا ہے مگر سبطِ حسن صاحب نے 'روشنائی' پر ایک مختصر تبصرہ ہفت روزہ 'لیل و نہار'، لاہور، میں ۲۴ فروری ۱۹۵۷ء کی اشاعت میں کیا تھا۔ اس وقت ان کے پیشِ نظر اس کتاب کا مکتبۂ اردو، لاہور کا شائع کردہ ایڈیشن تھا جس کی قیمت آٹھ روپے تھی۔ اس مختصر تبصرے پر 'لیل و نہار' کی روایت کے مطابق مبصر کا نام درج نہیں ہے مگر اُس وقت ادارۂ 'لیل و نہار' سے وابستہ حسن عابدی صاحب نے نشاندہی کی ہے کہ یہ تبصرہ سبطِ حسن صاحب نے کیا ہے۔ اندازِ تحریر اور اسلوب اس کی توثیق بھی کرتے ہیں۔ (مرتب)

ترقی پسند تحریک معتوب بھی رہی ہے اور مقبول بھی۔ غالباً کوئی ادبی تحریک نہ اتنی شدت سے موردِ عتاب ہوئی ہوگی نہ خواندہ لوگوں میں اتنی مقبول، جتنی ترقی پسند تحریک ہے۔ مخالف عناصر کہتے آئے ہیں کہ ترقی پسند ادیب، سرے سے ادیب ہی نہیں، وہ ادب کی آڑ لے کر اپنے مخصوص سیاسی عقائد کی ترویج کرتے ہیں، ان کا مقصد زندگی میں انتشار، فحاشی اور بے

دینی پھیلانا ہے۔ اس کے برعکس ترقی پسند ادیب، ادب میں زندگی کی ترجمانی کے دعویدار ہیں۔ وہ ادب کے وسیلے سے زندگی کو بدلنا، اسے سنوارنا اور نکھارنا چاہتے ہیں۔

ابتدا میں ترقی پسند ادیبوں اور ماضی کے خود ساختہ محافظوں کے درمیان اختلافِ رائے کا یہ عالم تھا کہ زندگی اور ادب کا تعلق بھی سرے سے محلِ نظر قرار دے دیا گیا تھا لیکن ترقی پسند ادیبوں نے اپنی مستقل مزاجی، خلوص، ادبی کاوش اور عالمانہ بحث و نظر کے بعد مخالف عناصر کی اکثریت کو یہ ماننے پر مجبور کردیا کہ زندگی کی ترجمانی کے بغیر ادب مہمل ہے۔ دراصل کوئی ادب، زندگی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ترقی پسند ادب کے بارے میں ابتدا میں بہت غلط فہمیاں بھی پیدا ہوئیں۔ یہ درست ہے کہ ۔

گفتارِ صدق مایہ آزار می شود

لیکن ترقی پسند تحریک کے لیے 'مایہ آزار' فراہم کرنے والوں میں وہ ادیب بھی تھے جو اپنی کم نظری کے سبب چونکا دینے والی ہر بات کو ترقی پسندی سمجھ بیٹھے تھے۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ترقی پسند ادب اور جدید ادب کا فرق واضح ہوتا گیا اور ترقی پسند نقادوں نے جنسی گمرہی، فحاشی، انفعالیت پرستی اور رجعتی میلانات کو ترقی پسندی کے منافی قرار دیا۔

سید سجاد ظہیر نے اس کتاب میں 'ترقی پسند ادب کی ایک تاثراتی اور چلتی پھرتی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔' وہ اسے ترقی پسند مصنفین کی تحریک کی تاریخ نہیں قرار دیتے بلکہ یہ اُمید رکھتے ہیں کہ 'جب ہماری ادبی تحریکوں کا مورخ اس کام کا بیڑا اٹھائے گا تو یہ تحریر مفید ثابت ہوگی۔' لیکن اس کے باوجود یہ کتاب ادب کی تاثراتی اور چلتی پھرتی تصویر سے بڑھ کر ایک پورے دور کی تہذیبی زندگی کا مبسوط جائزہ ہے۔ سید سجاد ظہیر ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں ہیں۔ ۱۹۳۵ء میں جب ترقی پسند مصنفین کا پہلا حلقہ لندن میں قائم کیا گیا تھا تو انجمن کا منشور تیار کرنے والوں میں وہ بھی شامل تھے۔ اس کے بعد سے ۱۹۴۷ء تک ادب

کے ایک پورے ہنگامہ خیز دور میں ان کی حیثیت میرِ کارواں کی سی تھی، وہ اس راہ کے ہر پیچ و خم اور نشیب و فراز سے گزرے ہیں اور ایک ایک چپے سے مانوس نظر آتے ہیں۔ اپنی یادداشت قلم بند کرنے میں انہیں غالباً اسی لیے سہولت ہوئی۔ اس لحاظ سے یہ تصنیف گزشتہ برسوں کی تہذیبی زندگی کا ایک جائزہ بھی ہے اور آپ بیتی بھی ہے۔

ترقی پسند تحریک کے ابتدائی چند برسوں کی روداد پہلے بھی شائع ہو چکی ہے لیکن ان میں تجربے کی وہ گہرائی اور وسعتِ نظر نہیں جو زیرِ نظر کتاب کے ابتدائی صفحات میں موجود ہے اور سب سے بڑی دلکشی تو سید سجاد ظہیر کا سادہ و رنگین اندازِ تحریر ہے۔ کتاب میں جا بجا مختلف ادبی اصناف، صحافت، اسٹیج اور فلم پر تنقید بھی ہے اور واقعات کی عکاسی بھی ہے۔ لیکن عبارت کہیں بھی غیر دلچسپ نہیں ہونے پائی ہے۔ کانفرنسوں کی روداد، ادیبوں سے خط و کتابت اور ملاقاتوں کے قصے، ادبی موضوعات پر گرما گرم مباحثے اور مناظرے اور روزمرہ واقعات کی چھوٹی چھوٹی جزیات اتنے دلکش پیرائے میں بیان کی گئی ہیں کہ قاری ان تمام مواقع پر اپنے آپ کو موجود محسوس کرتا ہے۔ بعض گزرے ہوئے ادیبوں مثلاً ٹیگور اور پریم چند کے علاوہ اکثر نئے ادیبوں کی شکل و شباہت، وضع قطع، بات چیت کے ڈھنگ اور مخصوص عادات کی مصوری نہایت پُرلطف پیرائے میں کی گئی ہے۔ اگر تمام تفصیلات اور جزئیات کو پیشِ نظر رکھا جائے تو مصنف کے حیرت انگیز حافظے کی داد دینی ہوگی۔ کیونکہ ۲۰، ۲۴ سال پرانی باتیں بھی اس اعتماد اور صحت کے ساتھ بیان کی گئی ہیں جیسے کل کی باتیں ہوں۔

جہاں تک کتاب کی طباعت کا سوال ہے یہ امر نہایت افسوسناک ہے کہ اس کے مسودے کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا۔ کتابت کی غلطیاں تمام کتاب میں، بالخصوص ابتدائی صفحات پر اتنی کثرت سے ہیں کہ اکثر فقروں کے معنی و مفہوم خبط ہو گئے ہیں۔ کاغذ کے استعمال میں غالباً یہ اصول پیشِ نظر رکھا گیا ہے کہ چار سو صفحات کی کتاب میں چالیس سے زیادہ قسم کے کاغذ لگائے جائیں، کوئی تو قاری کو پسند آئے گا۔

غزل اور حافظؔ کے دفاع میں

۱۹۸۳ء میں سجاد ظہیر کی کتاب 'ذکر حافظ' جو ہندوستان میں بہت پہلے شائع ہوچکی تھی، پاکستان میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی۔ اس کتاب پر سید سبط حسن نے کراچی کے انگریزی روزنامہ 'ڈان' میں ایک مفصل تبصرہ کیا جو اخبار کی ۲۳ دسمبر ۱۹۸۳ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔ ذیل میں اس تبصرے کا ترجمہ دیا جا رہا ہے۔ اس تبصرے پر In Defence of Ghazal and Hafiz کا عنوان قائم کیا گیا تھا۔ یہاں اس امر کی نشاندہی بھی ضروری ہے کہ سبط حسن کے تبصرے میں حافظؔ کے کئی اشعار کا انگریزی ترجمہ دیا گیا تھا۔ اس انگریزی ترجمے کا اردو ترجمہ اصل شعر سے کافی دور لے جاسکتا تھا۔ اس سلسلے میں 'ذکر حافظ' ہی نے مدد کی جس میں خوش قسمتی سے سجاد ظہیر نے حافظ کے فارسی اشعار کو جہاں جہاں نقل کیا ہے وہیں اس کا اردو ترجمہ بھی دے دیا ہے۔ ساتھ ہی حافظ کے کلام کا ایک انتخاب بھی کتاب میں شامل کیا ہے۔ چنانچہ سبط حسن نے جہاں حافظ کے اشعار کا انگریزی ترجمہ دیا ہے وہاں ہم نے انگریزی ترجمے سے اردو میں ترجمہ کرنے کے بجائے 'ذکر حافظ' سے فارسی اشعار اور ان کا سجاد ظہیر کا کیا ہوا ترجمہ نقل کردیا ہے۔

'ذکر حافظ' کا مکمل حوالہ درج ذیل ہے۔

سجاد ظہیر، 'ذکر حافظ'، کراچی: مکتبۂ دانیال، اپریل ۱۹۸۳ء، صفحات ۱۵۲، قیمت ۱۵ روپے

اس کتاب کے لیے سبط حسن صاحب کے انگریزی مضمون کا زیرِ نظر ترجمہ انور شاہین صاحب نے کیا ہے۔ (مرتب)

یہ کتاب فارسی کے عظیم ترین اور لازوال شاعر خواجہ حافظ شیرازی (م۔۱۳۹۱ء) کی شاعرانہ عبقریت کا ایک دلکش اعتراف ہے۔ اسے مرحوم سجاد ظہیر نے جو کہ برصغیر میں ترقی پسند مصنفین کی تحریک کے بانیوں میں سے تھے، مچھ جیل بلوچستان میں ۱۹۵۴ء میں تحریر کیا۔

حافظ شیرازی کو فارسی داں طبقے کی نظروں میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ انھیں 'لسان الغیب' اور 'ترجمانِ اسرار' کے خطابات بھی دیے گئے۔ زیادہ دور کی بات نہیں کہ 'دیوان حافظ' کو کسی وسوسے یا تذبذب کے عالم میں فال نکالنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ عام عقیدہ تھا کہ یونہی کسی بھی مقام سے 'دیوان حافظ' کو کھولنے پر کوئی قیمتی اشارہ مل سکتا ہے۔ اس سب کے باوجود حافظ کی ذاتی زندگی کے بارے میں بہت کم معلومات دستیاب ہیں۔ وہ شیراز میں متولد ہوئے، ان کے والد تاجر تھے، لیکن وہ اوائل عمر میں ہی داغِ مفارقت دے گئے اور حافظ کو روزی کمانے کے لیے نانبائی کی دکان پر کام کرنا پڑا۔ تاہم حافظ نے اسکول کی باقاعدہ تعلیم ضرور حاصل کرلی۔ وہ عربی خوب جانتے تھے اور قرآن کو بھی حفظ کر چکے تھے۔

انھیں شیراز کے حکمرانوں اور درباری معززین تک رسائی حاصل تھی۔ روایات تو یہاں تک پتہ دیتی ہیں کہ انھوں نے تیمور سے اس کی فتح شیراز کے موقع پر گفتگو بھی کی تھی۔ حافظ کی شہرت ان کی زندگی میں ہی دور دراز تک پھیل چکی تھی۔ انھیں بنگال اور دکن کے فرمانرواؤں نے دعوت بھی دی لیکن بحری سفر سے خائف ہونے کے باعث انھوں نے شائستگی سے انکار کردیا۔ وہ شادی شدہ تھے اور ان کے کئی بچے تھے۔

اس کتاب کے ابتدائی ابواب اردو اور فارسی کی ایک بے مثال صنف یعنی غزل کے حق میں لکھے گئے ہیں جو کہ اپنی ہیئت اور موضوعات کے سبب شاعری میں فطرت پسند مکتبۂ فکر کے بانیوں، مولانا الطاف حسین حالی اور مولوی محمد حسین آزاد کے زمانے سے ہی تنقید کی زد میں رہی ہے۔ غزل کو منتشر خیالات کا مجموعہ کہا گیا۔ یہ بھی کہا گیا کہ چونکہ اس کا ہر

شعر دوسرے شعر سے جدا اکائی ہے اس لیے اس میں خیالات و جذبات کا ارتقا اور تسلسل ممکن نہیں ہوتا۔ مزید برآں اس کے امکانات محدود ہیں اس لیے صدیوں سے غزل گوشعرا بیزار کن حد تک تکرار اور چربہ کرتے چلے آرہے ہیں۔ غزل کو زوال آمادہ جاگیری ثقافت کی پیداوار بھی قرار دیا گیا۔ کیونکہ یہ ثقافت اپنی افادیت کھو چکی ہے۔ لہٰذا کہا گیا کہ غزل کو بھی ترک کردیا جانا چاہیے۔

سجاد ظہیر اس اعتراض سے متفق نہیں ہیں گرچہ وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ عظیم عمدہ شاعری جس سے مکمل ذہنی و روحانی تسکین ملے اسے غزل تک محدود نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے خیال میں اردو اور فارسی غزل کا ہماری تہذیب اور جمالیاتی ذوق میں جو بھرپور کردار ہے اس کو مسترد کرنا مناسب نہیں ہے۔

اس حقیقت سے بھی صرف نظر نہیں کرنا چاہیے کہ گو اقبال، جوش ملیح آبادی، میراجی اور ن م راشد نے نظم کو ہی ترجیح دی ہے لیکن کم سے کم برصغیر کی حد تک ابھی بھی مقبول ترین صنف غزل ہی ہے۔ فیض احمد فیض اور فراق گورکھپوری استثنائی مثالیں ہیں کیونکہ انھوں نے اپنے جذبات کی ترجمانی کے لیے نظم اور غزل دونوں ہی کا آزادانہ انتخاب کیا ہے۔

حافظ بنیادی طور پر عشق کا شاعر ہے۔ اس کے اشعار اس ارفع ترین انسانی رشتے کے ثناخواں ہیں اور خود خالص ترین جذبات سے معمور ہیں ؎

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم
از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

(ہم نے سکندر اور دارا جنہوں نے غرور اور نفاق کی بنا پر ایک دوسرے سے جنگ کی تھی اور قتل وخون کیا تھا، کا قصہ نہیں پڑھا ہے، ہم سے مہر و وفا کی حکایت کے علاوہ اور کچھ مت پوچھو!)

خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی

مگر بنائے محبت کہ خالی از خلل است

(دنیا میں ہر شے (رشتے، عمل اور ادارے) کی بنیاد میں کھوٹ اور خرابی ہے، صرف محبت (یعنی باہمی تعاون، صلح اور احترامِ آدمیت) کی بنیاد پر قائم کیے ہوئے رشتوں میں کوئی خلل نہیں ہوتا۔)

حافظ کے خیال میں انسان کی تخلیق خدا نے اس لیے کی کہ وہ اپنی زندگی عشق کے لیے وقف کردے۔ 'میں راہ عشق کا مسافر ہوں اور عدم وجود کی سرحدوں سے وجود کے جہان میں اسی راہ پر چل کر آیا ہوں۔'

یہ فلسفۂ عشق وحدت الوجود کے معروف عقیدہ سے جنم لیتا ہے جس کے مطابق خدا اور اس کی تخلیق دو جدا جدا وجود نہیں ہیں بلکہ اس کے برعکس ہر مخلوق اس کی ذات کا اظہار ہے اور اس کے نور سے درخشاں ہے۔ چنانچہ نہ صرف انسان جو کہ اس کا بہترین مظہر ہے، بلکہ اشجار، پھول، کھیت، چشمے، ندیاں حتیٰ کہ شراب، میخانے اور مندر بھی خدا کے نور سے فیضیاب ہوتے ہیں ۔

در عشق و خانقاہ و خرابات شرط نیست
ہر جا کہ ہست، پرتوے روئے حبیب ہست

(عشق میں خانقاہ اور خرابات (شراب خانے) کی شرط نہیں ہے۔ جو بھی جگہ ہے وہاں حبیب (اللہ) کے ہی چہرے کی روشنی ہے)۔

در خرابات مغاں نور خدا می بینم
دیں عجب بیں کہ چہ نورے ز کجا می بینم

(خرابات مغاں میں، میں خدا کا نور دیکھتا ہوں، کیسے تعجب کی بات ہے کہ کیسا نور مجھے کہاں سے نظر آرہا ہے)۔

حقیقت کا یہی تصور شاعر کے لیے بنی نوع انسان کے عشق کا جواز مہیا کرتا ہے کیونکہ

یہ خود خدا کے عشق تک پہنچ جاتا ہے۔ حافظ کو یہ بھی یقین تھا کہ جو شئے بھی انسان کی مسرت اور طمانیت کا باعث بنے وہ خدا تعالیٰ کی مرضی کی توثیق کرتی ہے۔ دوسری جانب ہر شئے جو رنج و غم کا باعث بنے جیسے جبر، نا انصافی، ریا کاری اور دغا بازی، خدا کے قوانین کی خلاف ورزی اور اس کے عشق کی نفی ہے۔ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ حافظ کی عشقیہ شاعری نے پوری دنیا کے انسانیت نوازوں کو تحریک دی ہے۔ جرمن زبان میں اس کی نظموں کا ترجمہ سترھویں صدی کے وسط اور انگریزی و روسی میں اٹھارھویں صدی میں کیا گیا۔ ہمارے ہاں کے صوفیا اور درویش تو ان کے اشعار پر وجد میں آ جاتے تھے۔

حافظ کا دور تاریخ میں انتہائی خلفشار کا دور تھا۔ الخانی تاتاریوں کے زوال (۱۲۶۵ء۔ ۱۳۳۷ء) کے بعد ایران بہت سی چھوٹی ریاستوں میں منقسم ہوگیا تھا جن میں مسافرانِ شیراز، سب سے زیادہ اہم تھیں لیکن تاتاریوں کے مزید حملوں کا اندیشہ پس پردہ موجود تھا۔ خانہ جنگی آئے دن کا معمول بن چکی تھی۔ حکمرانوں کے سر وقفے وقفے سے قلم ہو رہے تھے۔ زندگی غیر محفوظ اور معیارِ زندگی انتہائی پست تھا۔ عام آدمی، دنیاوی و مذہبی دونوں طرح کے اہلکاروں کے ہاتھوں ظلم کی چکی میں پس رہا تھا اور اخلاقی قدروں کا جنازہ نکل چکا تھا۔

حافظ ان حالات سے لاتعلق نہیں رہ سکتے تھے۔ انھوں نے اس عہد کے شیراز کی حقیقت پسندانہ تصویر بہت مہارت سے ان لفظوں میں کھینچی ہے ۔

این چہ شور یست کہ در دور قمری بینم
ہمہ آفاق پر از فتنہ و شر می بینم
ہر کسے روز بہی می طلبد از ایام
مشکل این است کہ ہر روز تبر می بینم
ابلہان راہمہ شربت ز گلاب و قنداست
قوتِ دانا ہمہ از خونِ جگر می بینم

اسپ تازی شدہ مجروح بزیر پالان
طوق زریں ہمہ در گردن خر می بینم
دختران راہمہ جنگ است و جدل با مادر
پسرانِ راہمہ بدخواہ پدر ی بینم
ہیچ رحمے نہ برادر بہ برادر دارد
ہیچ شفقت نہ پدر را بہ پسر می بینم
پند حافظ بشنو خواجہ بروینکی کن
زانکہ ایں پند بہ از دُر و گہر می بینم

(زمانے میں یہ کیسا ہنگامہ ہے کہ میں ساری دنیا کو فتنے اور فساد سے بھری ہوئی دیکھتا ہوں۔ ہر شخص چاہتا تو یہ ہے کہ بہتر دن آئیں، لیکن مشکل یہ ہے کہ دن بدن حالت بدتر ہوتی جاتی ہے۔ جو بے وقوف ہیں ان کے لیے تو ہر وقت گلاب اور قند کا شربت مہیا ہے لیکن جو دانا ہیں ان کی غذا صرف خونِ جگر ہے۔ تازی گھوڑا تو پالان کے نیچے مجروح ہوگیا ہے لیکن جتنے گدھے ہیں ان کی گردنوں میں سنہرے طوق ہیں۔ لڑکیاں اپنی ماں سے صرف لڑنا بھڑنا جانتی ہیں اور لڑکے محض اپنے باپ کی بدخواہی میں مشغول ہیں۔ بھائی بھائی کے ساتھ مرحمت سے بالکل پیش نہیں آتا اور باپ اپنے لڑکے کے ساتھ شفقت نہیں کرتا۔ حافظ کی نصیحت سنو اور جا کر (ایک دوسرے کے ساتھ) نیکی کرو، اس لیے کہ یہ نصیحت ہیرے اور موتی سے زیادہ قیمتی ہے)۔

لیکن قرونِ وسطیٰ کے جاگیری معاشرے میں سانس لیتے ہوئے حافظ اس نظام سے ہٹ کر معاشرتی اصلاح کا کوئی اور انقلابی پروگرام دینے کی پوزیشن میں نہ تھے۔ سعدی

جیسے انسان دوست شخص کی روایات کی پیروی کرتے ہوئے وہ صرف حکمرانوں سے یہی اپیل کر سکے کہ وہ انصاف کریں اور رعایا کو اپنے اہلکاروں کے ظلم و جبر سے محفوظ رکھیں۔ وہ انھیں یہ کہتے ہیں کہ ؂

شاہ را بہ بود از طاعت صد سالہ زہد
قدر یک ساعت عمرے کہ دارد داد کند

(بادشاہ کے لیے وہ ایک لحۂ عمر کہ جب وہ انصاف کرتا ہے، اس کی سو سالہ عبادت پر بھاری ہے)

حافظ کے مطابق عوام کو مایوسی سے نکالنے کی ذمہ داری تین معاشرتی عناصر پر عائد ہوتی ہے جو کہ اشرافیہ، ریاست اور افسران مثلاً جج، پولیس، محتسب اور سب سے آخر میں علما، مفتی اور صوفی ہیں۔ لیکن یہی لوگ ہیں جنھوں نے اعتماد کو مجروح کیا ہے اور اپنا علم و قوت عوام کو دبانے، گمراہ کرنے اور اپنے محلات بنانے کے لیے وقف کر دیا ہے۔ یہی تو دغا باز اور ریا کار ہیں۔ حا؛ؒ نے اشرافیہ کو غرور و تکبر کے نتائج سے خبردار کیا ہے ؂

بگذر ز کبر و ناز کہ دیدہ است روزگار
چینِ قبائے قیصر و طرفِ کلاہِ کے

(غرور اور ناز چھوڑ دو، اس لیے کہ زمانہ دیکھ چکا ہے کہ قیصر کی قبا کی شکن اور کیخسرو کی کلاہ کی کج کا کیا حشر ہوا۔)

وہ ان امیروں کا تمسخر اُڑاتے ہیں جو اپنے قیمتی لباس اور دولت کی نمائش سے لوگوں کو متاثر کرنا چاہتے ہیں ؂

نہ ہر کہ چہرہ بر افروخت دلبری داند
نہ ہر کہ آئینہ سازد سکندری داند
نہ ہر کہ طرفِ کلہ کج نہاد و تند نشست

کلاہ داری و آئینِ سروری داند

(ہر وہ شخص جو اپنے چہرے کو چمکاتا ہے، دلبری نہیں جانتا۔ ہر وہ شخص جو آئینہ بناتا ہے، سکندری نہیں جانتا اور ہر وہ شخص جو کلاہ کو سر پر ٹیڑھا رکھتا ہے اور اکڑ کر بیٹھتا ہے، بزرگی اور سرداری کے اصول سے واقف نہیں ہوتا)۔

وہ نو دولیتے لوگوں کو بھی معاف نہیں کرتے بلکہ ان کی بھی مذمت کرتے ہیں ؎

یا رب ایں نو دولتان را برخر خود شانِ نشاں

کاین ہمہ ناز از غلام ترک و استری کنند

(خدا کرے، ان نو دولتیوں کو ان کے گدھے پر (جس پر سوار ہو کر وہ نکلتے ہیں) شان و شوکت نصیب ہو، یہ لوگ محض اس پر اکڑ رہے ہیں کہ ان کے پاس ترک غلام اور خچر ہیں)۔

وہ عوام سے کہتے ہیں کہ ریاست کے ارباب اختیار سے دور رہیں۔ وہ ان حکام کی صحبت کو رات کی سیاہی سے تعبیر کرتے ہیں۔

لیکن حافظ کی تنقید کا سب سے بڑا ہدف اہل اقتدار ہیں جو کہ پارسا اور خدا ترس ہونے کا ڈھونگ رچاتے ہیں لیکن ان کے قول و فعل میں تضاد ہوتا ہے۔ سجاد ظہیر کے مطابق کسی بھی اردو یا فارسی کے شاعر نے اتنے شدید اور موثر طریقے سے اپنے ہم عصر قاضیوں، مفتیوں، اساتذہ، متقی لوگوں اور مشائخ پر تنقید نہیں کی ہوگی جتنی کہ حافظ نے کی ہے (انھیں اقبال یاد نہیں رہے) حافظ ان سب سے نفرت کرتے ہیں کیونکہ وہ بہت بڑے ریاکار تھے اور حافظ کے نزدیک انسان کے کردار میں ریاکاری سے زیادہ کوئی اور وصف قابل نفرین نہیں ہوسکتا ؎

واعظاں کاین جلوہ در محراب و منبر میکنند

چون بخلوت میروند آن کارِ دیگری کنند

(واعظ جو کہ محراب اور منبر پر اپنا جلوہ دکھاتے ہیں جب خلوت میں
ہوتے ہیں تو کچھ اور ہی کام کرتے ہیں)۔

اور اہل عدل یا مفتی بھی کچھ کم نہیں ہیں وہ کبھی بھی سچ نہیں اگلتے۔ سوائے اس کے کہ نشے کی حالت میں ہوں ۔

فقیہہ مدرسہ دی مست بُود و فتویٰ داد
کہ مے حرام و لے بہ زمالِ اوقاف است

(کل مدرسہ کا فقیہہ مست تھا اور اس حالت میں اس نے یہ فتویٰ دے دیا
کہ شراب حرام ہے لیکن اوقاف کا مال غصب کرنے سے بہتر ہے)۔

یہ اس امر کی جانب خفیف سا اشارہ ہے کہ اہل عدل بھی شراب کے رسیا تھے۔ مزاروں و خانقاہوں کے متولی، نذر و نیاز پر قبضہ کر لیتے تھے جو کہ اسلامی قانون کی رو سے ایک گھناؤنا جرم ہے۔

حافظ کے مطابق مذہب اور امن وامان کے محافظوں میں ایک قدر مشترک ہے کہ دونوں جھوٹے اور فریبی ہیں ۔

مئے خور کہ شیخ و حافظ و مفتی و محتسب
چوں نیک بنگری ہمہ تزویر می کنند

(شراب پیو! اس لیے کہ شیخ اور حافظ، مفتی اور محتسب، اگر اچھی طرح
دیکھو تو، سب کے سب جھوٹے اور مکار ہیں)

زاہد شہر چو مہر ملک و شحنہ گزید
من اگر مہر نگارے بگزینم چہ شود

(جب شہر کے زاہد نے اپنے لیے بادشاہ اور کوتوال کے ساتھ دوستی کرنا
پسند کر لیا ہے تو پھر اگر میں ایک حسین معشوق سے محبت کرنے کا فیصلہ کر لوں

تو کیا ہرج ہے؟)

انھیں سب سے زیادہ دکھ شہروں کے واحد تخلیقی گروہ، اہل ہنر کی حالت زار پہ تھا۔ اس طبقے میں وہ شاعروں، ادیبوں اور موسیقاروں کو بھی شامل کرتے ہیں۔ اپنی ایک طویل نظم میں وہ ان کی تباہ حالی اور بے بسی کا ماتم یوں کرتے ہیں ۔

برنداز فاقہ پیش ہر خسیسے کنوں اہل ہنر دست گدائی
کسے کو، فاضل است امروز در دہر نمی بیند زغم یک دم رسائی
کسے کو جاہل است اندر تنعم متاع او بود ہر دم بہائی
اگر شاعر بخواند شعر چوں آب کہ دل راز و فزاید روشنائی
نہ بخشندش جوے از بخل دا ساک اگر خود فی المثل باشد سنائی
خرد درگوش ہوشم درش می گفت برو صبرے بکن درب نوائی

بیا حافظ بجاں ای پند بینوش
کہ گہ از پا بیفتی برسر آئی

(فاقہ کشی سے مجبور ہوکر اہل ہنر ہر ایک کنجوس کے آگے دست گدائی پھیلاتے ہیں۔ آج وہ لوگ جو زمانے میں فاضل مانے جاتے ہیں ایک لمحے کے لیے بھی غم سے رہا نہیں ہیں۔ اور وہ لوگ جو جاہل ہیں عیش کی زندگی بسر کرتے ہیں اور ان کی متاع (یعنی جہالت) کی ہر دم قیمت دی جاتی ہے۔ اگر شاعر ایسا شعر پڑھے جو پانی کی طرح (صاف اور روشن) ہے اور جس سے دل کی روشنی بڑھتی ہے تو، چاہے وہ سنائی کی طرح کا ہی (بڑا شاعر) کیوں نہ ہو، بخل اور کنجوسی کی وجہ سے اسے ایک جو بھی نہیں ملے گا۔ عقل نے کل میرے ہوش کے کان میں کہا کہ جا اور اپنی اس بد حالی کو صبر کے ساتھ برداشت کر، حافظ میری جان کی قسم! میری یہ نصیحت سن کہ اگر آج تو

گر پڑا ہے تو کل تیرا سرا اونچا ہوگا۔)

حافظ اپنے گرد و پیش کی زندگی سے قطعاً مطمئن نہ تھے اس لیے وہ نئے انسان کی مدد سے ایک نئی دنیا تعمیر کرنا چاہتے تھے ۔

آدم خاکی دریں عالم نمی آید بدست
عالم دیگر بباید ساخت از نو آدمے

(ہم اس دنیا میں (سچے اور اصلی) آدمی کی تلاش کرتے ہیں لیکن وہ نہیں ملتا، اس لیے ایک نئے آدم ایک دوسری دنیا کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں)۔

یہ کہا جاتا ہے کہ حافظ فراریت پسند تھے اور یہ کہ ان کی شاعری افیون کے مانند ہے کہ جو انسانوں کو مفلوج کر دیتی ہے اور انھیں اخلاقی تنزلی اور انحطاط کی زندگی گزارنے پر مائل کرتی ہے۔ سجاد ظہیر نے سختی سے ان بے بنیاد الزامات کی تردید کی ہے۔ انھوں نے یہ سوالات اٹھائے کہ کیا حافظ کا نوعِ انسانی سے محبت اور اس کی دوستی پر اصرار لذت پسندی ہے؟ کیا لوگوں سے زندگی کے حسن کی توصیف کرنا فراریت ہے؟ کیا بدنما، بدکردار، ظالمانہ اور غیر منصفانہ چیزوں کا راز فاش کرنا اور ان پر تنقید کرنا لوگوں کو بے عمل اور بہت زیادہ بے زبان بنا دیتا ہے؟ ان کی نظر میں حافظ کی شاعری لوگوں کو جمالیاتی اعتبار سے زیادہ بھرپور بناتی ہے اور ان کے معاشرتی شعور کو جلا بخشتی ہے۔

تقریباً چھ سو سال گزر چکے ہیں لیکن حافظ کی دلنشیں شاعری میں آج بھی ہمارے لیے کشش ہے۔ کیونکہ ہماری جمالیاتی اور اخلاقی اقدار بھی کم و بیش وہی ہیں جو حافظ کی تھیں اور ان کی سماجی برائیوں پر کی گئی تنقید آج بھی صاد آتی ہے۔ ان کی غزلیں ایک ایسا آئینہ ہیں کہ جس میں ہم اپنی زندگی کا بدنما چہرہ آسانی پہچان سکتے ہیں۔

سبطِ حسن کے نام، سجاد ظہیر کے دو خط

(۱)

لندن۔ ۹ر جولائی ۱۹۷۳ء

پیارے سبطے، میں تین دن ہوئے ماسکو سے لندن پہنچا۔ اور نجمہ[۱] اور علی باقر[۲] کے ساتھ مقیم ہوں۔ بالکل اچھا ہوں۔ انگلستان کا موسم غیر معمولی طور پر اچھا ہے۔ خوشگوار خنکی ہے اور دھوپ۔ سوویت یونین میں بھی کوئی ایک مہینے رہا۔ وہاں جون کے پہلے ہفتے میں پہنچا تھا۔ افرو ایشیائی ادیبوں کے پرمننٹ بیورو کی میٹنگ تھی جس کے لیے تمہارے یہاں سے فیض بھی آئے تھے، فیض سے کہا تھا کہ تمہارے لیے خط لیتے جائیں لیکن وہ جلدی میں چلے گئے اور میں ان کو خط نہ دے سکا۔ بہرحال تمہاری خیریت اُن سے معلوم ہوگئی اور یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ تم بالکل اچھے ہو۔

سب سے پہلے تمہارا شکریہ ان کتابوں کے لیے جو تم نے بھیجیں۔ یعنی تمہاری اپنی تصنیف[۳]، مخدوم،[۴] مصطفیٰ زیدی کا مجموعہ[۵] اور ایک ناول[۶] اب یہ سب یہاں اطمینان سے پڑھوں گا۔ میں نے مئی میں ایک ہندوستانی ہفتے وار کے لیے پاکستانی ادب پر ایک چھوٹا سا مضمون بھی لکھا تھا۔ ہندوستان میں پاکستانی کتابیں بڑی مشکل سے یا بالکل نہیں ملتیں۔

پرانے نقوش کے بل پر اور پرانی کتابوں کی بنیاد پر تھا۔ پھر بھی وہاں کے لیے موجودہ حالات میں شاید غنیمت تھا۔ براہِ مہربانی اچھی کتابیں بھیجتے رہو بہت شکر گزار ہوں گا۔ بدلے میں مجھے کتابیں بھیجنی چاہئیں، لیکن ہندوستان سے اتنی جلدی میں چلا کہ اپنے ساتھ کچھ لا نہیں سکا۔ لیکن میرا یہ تم سے وعدہ ہے ضرور بھیجوں گا۔

ادھر دو چار دن سے یہ خبریں چھپ رہی ہیں کہ ہندوستان اور پاکستان کے مذاکرات ۲۷ جولائی کو ہونے والے ہیں۔ خدا کرے کہ صلح صفائی کی گاڑی کچھ آگے بڑھے۔

میاں ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ کم از کم لوگوں، کتابوں، اور رسالوں کا آنا جانا شروع ہوجائے۔ باقی باتیں بعد کو ہوتی رہیں گی۔ شملے کے سمجھوتے کے بعد کچھ امید بندھی تھی لیکن سال بھر یونہی گزر گیا۔ کاش کہ پاکستانی جنگی قیدی جلد اپنے وطن واپس جائیں اور دوسری باتیں طے ہوں۔ اس تعطل سے سخت کوفت ہے۔

ہم ماسکو میں دہلوی صاحب [۷] سے ملے۔ ان سے عشق آباد میں ملاقات ہوئی تھی۔ بڑی محبت اور مہربانی سے ملے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں بہ حیثیت ایک جرنلسٹ کے ('حیات' کا ایڈیٹر ہوں) صدر بھٹو سے انٹرویو کے لیے اور دوسرے دوستوں سے ملنے کے لیے پاکستان آنا چاہتا ہوں۔ اجازت ملے گی۔ حکومت ہند تو غالباً مجھے اجازت دے گی (گو کہ ابھی کہا نہیں ہے)۔ انہوں نے کہا کہ وہ اس کے متعلق پاکستان سرکار کو لکھیں گے۔ لیکن بہتر ہے کہ اگر میں یہ بات ممتاز دولتانہ [۸] سے کہوں۔ اب یہاں دولتانہ سے بھی ملوں گا۔ فیض سے بھی یہ بات کہہ دی ہے۔

تم سے اور روشن [۹] سے ملنے کو بہت دل چاہتا ہے۔ میں یہاں ۱۴ راگست تک مقیم ہوں۔ یہاں آؤ تو ساتھ تھیٹر دیکھیں گے۔ اچھی اچھی فلمیں، انڈیا آفس کی لائبریری میں فارسی کے نادر مخطوطات، اور تم غنی کے مزاروں کو اور گہرا کھودنا۔ یہاں کے علما سے ملنا۔ آپ حسن [۱۰] کا بہت بڑا گھر ہے وہ تمہیں مہینے دو مہینے کے لیے خوشی سے رکھ لیں گے۔

یہاں ایک برطانیہ کی انجمن ترقی اردو بھی ہے۔ اس نے پرسوں ایک مشاعرہ کیا تھا جس میں ہم نے اپنا کلام سنایا۔ پاکستانی اور ہندوستانی اور برطانوی اردو بولتے ایک ساتھ دیکھ کر بڑی خوشی ہے۔ کیا بات ہے لندن کی، کہ یہاں سب مل سکتے ہیں۔

۴رستمبر سے آلما آتا میں افریشیائی ادیبوں کی کانفرنس ہے۔ میں یہاں اس لیے رک رہا ہوں کہ سیدھا یہاں سے ماسکو ہوتا ہوا وہاں جاؤں۔ پھر کچھ دنوں (کانفرنس کے بعد) تاشقند میں ہندوستانی اور سوویت ادیبوں کا ایک سیمینار ہے اس میں شرکت کروں گا۔ اور ستمبر کے آخری ہفتے ہندوستان جاؤں گا۔

اچھا سبطے میاں، فی الحال یہ خط ختم کرتے ہیں۔ تم اس کا جواب فوراً دو۔ روشن کو ضرور پیار اور دعا کہنا اور اشتیاقِ ملاقات، پتہ اوپر لکھا ہے۔ تم علی باقر کو ہی خط بھیجنا وہ مجھے دے دیں گے۔

بہت پیار

تمہارا

بنّے

حواشی

۱۔ سجاد ظہیر کی سب سے بڑی صاحبزادی

۲۔ ان کے شوہر

۳۔ جس زمانے کو یہ خط ہے اُس زمانے میں سید سبطِ حسن، کتب پرنٹرز و پبلشرز لمیٹڈ کے نگراں تھے، جو [illegible] نے [illegible] کراچی میں اپنے دفاتر کے احاطے میں قائم کیا تھا۔ اس ادارے نے [illegible] پاکستان میں تہذیب کا ارتقا کا پہلا ایڈیشن شائع کیا تھا۔ امکانِ غالب ہے کہ [illegible] کتاب جو ظہیر کو بھجوائی ہوگی۔ (مرتب)

۴۔ [illegible] چھپنے والی کتاب بھی اسی ادارے نے شائع کی تھی۔ اس کے مرتب [illegible] صاحب تھے۔ (مرتب)

۵۔ [illegible] پبلشرز نے ہی شائع کیا تھا۔ (مرتب)

۶۔ گو'ایک ناول' کے الفاظ سے یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ سبط حسن نے کون سا ناول سجاد ظہیر کو بھیجا تھا لیکن اس امر سے کہ باقی کتابیں جو سجاد ظہیر کو بھیجی گئی تھیں وہ کتب پرنٹرز کی شائع کردہ تھیں، یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ناول بھی اسی ادارے کا شائع کردہ بھیجا گیا ہو۔ اس زمانے میں اس ادارے نے ایک ہی ناول شائع کیا تھا۔ یعنی شہید اللہ قیصر کے بنگالی ناول کا اردو ترجمہ بعنوان 'ملاح کی بیوی'۔ یہ ترجمہ سعیدہ گزدر نے کیا تھا۔ (مرتب)

۷۔ مسٹر ایس کے دہلوی۔ سفیر پاکستان متعینہ سوویت یونین۔

۸۔ ممتاز دولتانہ ان دنوں برطانیہ میں پاکستان کے سفیر تھے۔

۹۔ روشن علی بھیم جی، منیجنگ ڈائریکٹر ایسٹرن فیڈرل انشورنس۔

۱۰۔ بی بی سی

(۲)

۲۴ر جولائی ۷۳ء

لندن

پیارے سبطے ـ تمہارا ۱۸ر کا خط ابھی ابھی ملا ـ بہت خوشی ہوئی ـ مدتوں بعد ملاقات نہ سہی خط و کتابت تو ہوئی ـ یہ کیسی غیر فطری صورتِ حال ہے کہ دوست اور عزیز ایک دوسرے سے مل نہیں سکتے اور نہ ایک ملک سے دوسرے ملک آ جا سکتے ہیں ـ دہلی سے ماسکو یا لندن جانا آسان ہے، امرتسر سے لاہور ناممکن ہے ـ یورپ والے آپس میں بڑی بڑی خوفناک لڑائیاں لڑتے ہیں ـ فرانس اور جرمنی تو شارلیمین کے زمانے سے یعنی ہزار سال سے ہر صدی میں کئی لڑائیاں لڑ لیتے ہیں ـ لیکن لڑائی بند ہوئی اور آنا جانا، تجارت، لین دین شروع ہو جاتا ہے ـ لیکن ہماری دشمنیاں اتنی مجنونانہ ہیں کہ اپنا بھلا اور انسانیت دونوں بھول جاتے ہیں ـ میاں دعا کرو کہ ہماری تمہاری زندگی میں کم از کم یہ صورت تو ختم ہو ـ آج اسلام آباد میں گفتگو شروع ہو رہی ہے میرا خیال ہے کہ اس بار مثبت نتیجہ نکلے گا ـ لیکن کتنا مثبت کہ ہر مرتبہ جب ملتے ہیں تو گاڑی آگے بڑھتی ہے لیکن کچھ دور چل کر پھر دلدل میں پھنس جاتی ہے ـ

میاں تم ہمارے یہاں رہتے لندن ضرور آؤ ـ کیا بانکا شہر ہے ـ تھیٹر فلمیں، نادر کتب

خانے اور پکچر گیلریاں ایسی جن کا جواب نہیں۔ پارک، پھول، چھوٹے بڑے باغ، ایسے رنگین اور معطر۔ دکانیں ایسی جن کی سجاوٹ بے مثال، موسم میں معشوقوں جیسا تلون، صورتیں، تصویر، پھر انگریزوں کی قدامت پرستی بھی بڑی دلچسپ ہے۔ جب افغانستان کے شاہ بھی اٹلی کی سیر کرنے کو بھیج دیے گئے تو یہاں شاہی خاندان کا ڈرامہ بدستور جاری ہے۔ اور آکسفورڈ اور کیمبرج کے کالجوں میں اندر جاؤ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چھ سو برس پہلے بھی یہ ایسے ہی رہے ہوں گے۔ روشن[1] کو فون کیا معلوم ہوا کہیں باہر گئے ہیں۔ پرسوں واپس آئیں گے ان سے ضروری ملوں گا۔ آل حسن[2] اور تمہارے دوسرے دوستوں کو تمہارا پیغام پہنچا دوں گا۔ نورانیوں[3] کو میرا سلام اور دعا کہنا۔ اس کی خوشی ہے کہ وہ خوشحال ہیں اور کام کر رہے ہیں۔ ان کی محبتیں اور عنایتیں بہت یاد آتی ہیں۔ میں تمہاری کتاب ماضی کے مزار آج ہی سے پڑھنا شروع کروں گا۔ تم نے جماعتِ اسلامی کے اعتراضات کا جواب بھی لکھا یا نہیں۔ ان کے اعتراضات اور اپنے جواب کے تراشے ضرور بھیجو یہ بہت اچھا ہے کہ تم نے (کوہ ندا) ہندوستان میں شائع کرنے کی مجھے اجازت دے دی۔ وہاں پاکستانی ادب پر لوگ جان دیتے ہیں۔ اس کے شائع ہونے میں کوئی دقت نہ ہوگی۔

۴ ستمبر سے آلما آتا میں افریشیائی ادیبوں کی کانفرنس ہے۔ اگر تم پاکستانی ڈیلی گیشن میں شامل کر لیے گئے تو تم پھر تم یہاں لندن سے ہی ماسکو اور آلما آتا جا سکتے ہو۔

میں بالکل اچھا ہوں۔ نجمہ کے یہاں بے حد آرام ہے۔ ان کا فلیٹ بھی بڑا اچھا ہے۔ آج کل ہماری تیسری بیٹی جو ڈرامے کی ماہر ہیں اور ایکٹریس بھی ہیں یہاں مقیم ہیں۔ وہ ایک سال GDR میں تھیٹر کی ٹریننگ کے لیے گئی تھیں۔ وہاں کام ختم کر کے لندن آئی ہیں اور مہینے بھر بعد واپس جائیں گی۔

میں یہاں آیا تو پاکستانی سفیر ممتاز دولتانہ سے ملنے کی کوشش کی۔ فون پر باتیں ہوئیں۔ آج کل تو صدر بھٹو یہاں ہیں۔ ان کے جانے کے بعد ملاقات ہوگی۔ ماسکو میں

دہلوی سے ملا تھا۔ خوب لمبی چوڑی گفتگو ہوئی۔ ہم ان لوگوں سے کہہ رہے ہیں کہ جب گئی ہندوستانیوں کو (آخری خشونت سنگھ) کو اجازت دیتے ہیں تو ہمیں بھی دیں۔

اچھا بھئی خدا حافظ۔ اب تمہارے یہاں آنے کی خبر سننے کا انتظار ہے

بہت پیار
تمہارا
بنّے

حواشی

۱۔ روشن علی بھیم جی۔
۲۔ پی بی سی
۳۔ ملک نورانی اور ممتاز نورانی

سید سجاد ظہیر کا شمار انجمن ترقی پسند مصنفین کے بانی ارکان میں ہوتا ہے۔ وہ انجمن کے پہلے جنرل سیکریٹری بھی تھے۔ سید سبطِ حسن بھی انجمن کے ابتدائی وابستگان میں شامل تھے۔ چنانچہ ابتدا ہی سے ان کو سجاد ظہیر کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ دونوں رہنماؤں کا ہندوستان اور پاکستان کی کمیونسٹ تحریک کے ساتھ بھی قریبی بلکہ قائدانہ تعلق تھا۔ سجاد ظہیر کے بارے میں سبطِ حسن کی یہ کتاب ان کے مختلف مضامین پر مشتمل ہے ان مضامین میں انہوں نے سجاد ظہیر کی شخصیت، ان کی فکر اور سیاسی خدمات کا جائزہ لیا ہے۔ اس اعتبار سے اس کتاب کی ایک تاریخی اہمیت ہے بالخصوص اس میں شامل سبطِ حسن کے پہلے مضمون "الہ آباد سے اشک آباد تک۔ یادوں کا سفر" کی جو پہلی مرتبہ منظرِ عام پر آرہا ہے اور جس کو اس کتاب کے مرتب نے بڑی محنت کے بعد سبطِ حسن مرحوم کے منتشر کاغذات میں تلاش کر کے قارئین کے لیے پیش کیا ہے۔

اس کتاب میں سجاد ظہیر اور ان کے حوالے سے انجمن ترقی پسند مصنفین اور کمیونسٹ پارٹی کی خدمات اور ان کی کمزوریوں کا انتہائی مخلصانہ مگر معروضی انداز میں جائزہ لیا گیا ہے۔ اُمید ہے کہ یہ کتاب ہندوستان اور پاکستان کی سیاسی اور تہذیبی تاریخ میں ایک حوالے کی حیثیت اختیار کر جائے گی۔

اس کتاب کے مرتب ڈاکٹر سید جعفر احمد اس سے قبل سبطِ حسن مرحوم کی دو کتابیں 'افکارِ تازہ' اور 'ادب اور روشن خیالی' کے نام سے مرتب کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر سید جعفر احمد کراچی یونیورسٹی کے پاکستان اسٹڈی سینٹر سے وابستہ ہیں جہاں وہ سیاسیات و تاریخ کے پروفیسر کی حیثیت سے تدریس و تحقیق کی ذمہ داریاں سرانجام دے رہے ہیں۔ انہوں نے کراچی یونیورسٹی سے سیاسیات میں ایم۔اے اور پاکستان اسٹڈیز میں ایم فل کرنے کے بعد برطانیہ کی کیمبرج یونیورسٹی سے سماجی و سیاسی علوم میں پی ایچ ڈی کیا ہے۔ سیاسیات، تاریخ، تعلیم، حقوقِ انسانی اور امن کے موضوعات پر ان کی کئی کتابیں اور مقالات شائع ہو چکے ہیں۔